تعارف مقالہ

''قرآن مجید کے آٹھ منتخب اردو تراجم کا تقابلی جائزہ''

محمد اعظم سعیدی
مہتمم، جامعہ اسلامیہ کورے وال، کراچی

محترم ڈاکٹر محمد شکیل اوج کی قبل ازیں بھی چند کتب و مقالہ جات طبع ہو کر اہل علم میں مقبولیت کی سند حاصل کر چکے ہیں اور یہ کہنا بھی مناسب ہوگا کہ ان مقالات و کتب نے ڈاکٹر صاحب موصوف کے زاویہ فکر کا تعین کر دیا ہے اور قرآن سے ان کے تعلق اور گہری لگن کو بھی مشخص کر دیا ہے اور زیر نظر کتاب ''قرآن مجید کے آٹھ منتخب اردو تراجم کا تقابلی جائزہ'' اس تعلق کی بین شہادت ہے۔ یہ کتاب ڈاکٹر صاحب کا وہ تحقیقی مقالہ ہے جس پر جامعہ کراچی نے موصوف کو پی ایچ ڈی (Ph.D) کی ڈگری ایوارڈ کی ہے۔ اس کتاب کی جامعیت و اہمیت تو اس کے نام سے ہی عیاں ہے۔ پھر جن منتخب آٹھ اردو تراجم کا تقابلی جائزہ لیا گیا ہے، ان میں سے ہر مترجم اپنے فکر و عقیدہ میں اسکول آف تھاٹ کی حیثیت کا حامل ہے اور وہ بھی ایسے جو اپنے متبعین و معتقدین میں حرف آخر ہیں۔ ایسے حضرات کے تراجم کو تقابل و تجزیہ کی کسوٹی پر پرکھنے کی سعی کو جسارت کا نام ہی دیا جا سکتا ہے لیکن اس شخصیت پرستی کے عہد میں صرف اور صرف ایک محقق ہی ایسا قدم اٹھا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈگری ایوارڈ ہونے کے ساتھ ہی جہاں اہل علم و دانش نے اس سعی جمیل کو بے حد سراہا، وہاں مطالعہ کی زحمت سے نا آشنا شخصیت پرستوں نے چہ میگوئیاں بھی کیں اور اپنے زعم کے زیر سایہ یہ باور کرلیا کہ ضرور ہمارے مقتدا کے ترجمہ کو کمتر کرنے کی کوشش کی گئی ہوگی۔ چنانچہ اس سوچ کو عوامی محافل و مجالس میں خوب پھیلایا گیا، مگر ''الحق یعلوا ولا یعلی'' کے مصداق حق نے اپنی رفعت کو خود تسلیم کروایا کہ اہل علم میں ان منتخب اردو تراجم کے تقابلی جائزے کی خوب پذیرائی ہوئی۔

اب یہ مقالہ دارالقلم کیرالا ہور سے کتابی شکل میں طبع ہو کر منظر عام پر آ گیا ہے۔

اس تحقیقی مقالہ میں تین فصول ہیں۔ فصل اول بطور مقدمہ کے ہے جس میں موضوع کی اہمیت، ضرورت اور تعارف کے زیر عنوان قرآن مجید کے اردو تراجم کی افادیت کو واضح کرنے کے ساتھ

ساتھ تراجم کی نوعیت اور اپنے عہد کے اسکول آف تھاٹ ہونے کی عقدہ کشائی بھی کی گئی ہے اور اپنے مضبوط طرز استدلال سے یہ باور کرایا ہے کہ قرآن فہمی کو زندان مسلک میں مقید نہ کیا جائے بلکہ مسلک کو تصور قرآن کے عین سانچے میں ڈھالا جائے۔ چنانچہ فاضل محقق نے اسی نقطہ نظر کو اجاگر کرنے کے لیے آٹھ منتخب اردو تراجم قرآن کے حسن کو ایک گوہر شناس جوہری کی طرح پرکھا ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے جن ذی وقار شخصیات کے تراجم کو موضوع تحقیق و تجزیہ بنایا ہے وہ درج ذیل ہیں۔

(۱) مولانا محمود الحسن دیوبندی
(۲) مولانا احمد رضا خان بریلوی
(۳) مولانا ثناء اللہ امرتسری
(۴) مولانا عبدالماجد دریابادی
(۵) مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی
(۶) مولانا امین احسن اصلاحی
(۷) مولانا پیر محمد کرم شاہ ازہری
(۸) مولانا ابو منصور

فاضل محقق نے مذکورہ مترجمین عظام کے تراجم سے منتخب آیات کا تقابلی جائزہ ''اقیموا الوزن بالقسط'' کے تتبع میں کیا ہے اور اس سلسلے میں کسی مترجم کی عقیدت کو تحقیق کی راہ میں سد سکندری نہیں ہونے دیا اور نہ ہی کسی طرف اپنے جھکاؤ کو ظاہر ہونے دیا ہے۔ یہی ایک محقق وقاد کا عدل ہے۔

فصل دوم میں موضوع کا دائرہ بحث و تحقیق کو بیان کرنے کے لیے چھ ذیلی عنوانات قائم کیے ہیں اور ساتھ ہی اپنی تحقیق و تجزیہ کے لیے دیگر محققین کی طرح مختلف سورتوں سے من پسند آیات کا انتخاب کرنے کے بجائے ''عم پارہ'' کو بنیاد بنانے کی وجہ بھی بیان کر دی ہے ورنہ حسب روایت یہ تاثر پیدا ہو جاتا کہ یہاں بھی کسی پسندیدہ ترجمہ کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ نیز اس فصل میں یہ بھی واضح کر دیا کہ عم پارہ کی صرف انہی آیات مبارکہ کو موضوع تحقیق و تجزیہ بنایا ہے جن کے ترجمہ میں مترجمین کے مابین کوئی معنوی، لغوی، صرفی، نحوی یا ادبی فرق محسوس کیا ہے۔ جن آیات کے تراجم میں کوئی معنوی یا لغوی فرق نہیں تھا یا وہ آیات کہ جن کو کوئی اپنے مسلک کے لیے نمائندہ تصور کرتا ہے انہیں دائرہ تحقیق و تقابلی جائزے میں نہیں لایا گیا۔

فصل سوم میں موضوع کے لازمی مصادر اور اسلوب تحقیق کے زیر عنوان اختیار کیے گئے طرز تحقیق اور اسلوب نگارش کو مفصل بیان کر کے بطور نتیجہ یہ بتایا گیا ہے کہ اس انداز تحقیق سے مذکورہ تراجم کے حوالے سے پوشیدہ گوشوں اور متنوع اختلافی امور اظہر من الشمس ہو گئے ہیں۔ یہ فصل چھ ابواب اور اختتامیہ پر مشتمل ہے۔

پہلے باب میں عہد نبوی ﷺ سے عہد حاضر تک قرآن حکیم کے ترجموں کی ضرورت و اہمیت پر

تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے اور علامہ سیوطی کی الاتقان کے حوالے سے تقریباً 59 مفسر قرآن صحابہ کرام کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اسی طرح عہد تابعین میں حضرت عبداللہ ابن عباس کی سربراہی میں مکہ مکرمہ کے تفسیری مکتب، حضرت ابی بن کعب کی سربراہی میں مدینہ منورہ کے تفسیری مکتب اور حضرت عبداللہ بن مسعود کی سربراہی میں عراق کے تفسیری مکتب سے مع اسماء مفسرین روشناس کرایا گیا ہے پھر ترجمہ کی ضرورت واہمیت کو یہ کہہ کر اجاگر کیا گیا ہے کہ قرآن مجید کے مدعا ومفہوم کو سمجھنے اور قرآن سے حصول افادہ واستفادہ کے لیے ترجمہ بنیادی شرط ہے۔ اس کے بغیر قرآن کی تفہیم وتفسیر اور مراد تک رسائی ناممکن ہے، یہی وجہ ہے کہ دنیا کی بکثرت زبانوں میں قرآن مجید کا ترجمہ ہوا ہے اور یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

دوسرے باب میں قرآن مجید کے اردو تراجم کی ابتدا اور اس کا ارتقائی جائزہ لے کر یہ بتایا گیا ہے کہ دسویں صدی ہجری یعنی کم وبیش چار سو سال پہلے سے اردو میں قرآن کریم کے تراجم کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا اور اسی صدی کے اواخر میں تفسیری حاشیہ نگاری بھی شروع ہو گئی تھی، اگرچہ یہ دونوں کام مکمل اور بالاستیعاب نہیں تھے اور زبان بھی ابتدائی عہد کی تھی پھر بھی کام ہوا اور اسی عہد کی ضرورت کو کچھ نہ کچھ پورا کیا گیا۔ جن کے کئی مخطوطے (قلمی نسخے) مختلف کتب خانوں اور لائبریریوں میں محفوظ ہیں، جبکہ لفظی اور بامحاورہ اردو میں مکمل ترجمہ قرآن شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر دہلوی کے ہیں یعنی دونوں کے مکمل تراجم کا سہرا دونوں بھائیوں کے سر ہے۔ نیز اس باب میں تفہیم قرآن کے ارتقاء پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور ساتھ ہی انیسویں صدی کے مکمل اور مطبوعہ تراجم قرآن کا مختصر اشاریہ بھی دیا گیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ 1829ء سے 1900ء تک اردو زبان میں 34 مکمل تراجم قرآن طبع ہو کر منظر عام پر آئے۔ اس کے بعد بیسویں صدی یعنی 1901ء تا 1983ء تک قرآن مجید کے وہ اردو تراجم جو کہ غیر مطبوعہ اور مکمل ہیں ان کا اشاریہ دیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ گذشتہ صدی میں 53 تراجم قرآن طبع ہو کر منظر عام پر آئے ان میں 34 تراجم تو مع ضخیم تفاسیر وحواشی کے ہیں صرف نو عدد محض تراجم ہیں۔ نیز کچھ تفسیری تراجم کی بھی نشاندہی کی گئی ہے۔ واضح رہے کہ 1983ء کے بعد کے تراجم اس میں شامل نہیں کیے گئے، اسی طرح انیسویں اور بیسویں صدی کے غیر مطبوعہ تراجم کا بھی ذکر نہیں کیا گیا۔

تیسرے باب میں آٹھ منتخب اردو تراجم کے ترجمہ نگاروں کی حیات کا تعارف اس طرح کرایا گیا ہے کہ ان کا خاندانی پس منظر، ولادت، تحصیل علم، پھر علمی، تدریسی، تحریکی، تقریری وتصنیفی کاوشوں اور کارناموں کا مکمل احاطہ کیا گیا ہے، اس سلسلے میں کم وبیش 91 صفحات وقف کیے گئے ہیں۔

چوتھے باب میں منتخب آیات کے ترجمہ کے تقابلی جائزے سے پہلے اس حقیقت کا اظہار کر دیا

گیا ہے کہ قرآن مجید کی الہامی ومعجزاتی زبان کا کسی بھی زبان میں من وعن ترجمہ کرنا اگر مشکل نہیں تو آسان بھی نہیں ہے اور کوئی بھی مترجم ہزار ہا زبان وبیان پر قدرت رکھنے اور سعی وجہد کے باوجود اس پر قادر نہیں ہو سکا، بایں ہمہ مترجمین نے حسب استطاعت اپنے اپنے فہم وادراک اور علمی وسعت کے مطابق قرآنی الفاظ کے معنی ومفہوم کو اپنی اپنی زبانوں میں منتقل کرنے کی جو سعی بسیار کی ہے وہ لائق تحسین ہے۔

محقق کے اس اظہار حقیقت کے بعد یہ امر عیاں ہو گیا کہ منتخب اردو تراجم کے مترجمین کی کاوشوں کو سراہا گیا ہے اور ان کے تراجم کو زبان وبیان، مروج گرامر، مرادات، محذوفات، ماقبل ومابعد سے رابطہ، ادبیات اعلیٰ اور لغت واصطلاح کی کسوٹی پر پرکھا گیا ہے پھر جو ترجمہ کسی بھی زاویہ سے الفاظ قرآن کی روح کے مطابق ٹھہرا، اسے ماہر صراف کی طرح آب زر سے مزید چمکا دیا یعنی سونے پر سہاگہ کر دیا ہے کیونکہ محقق کا اصل مقصود کسی ترجمہ کو نہیں بلکہ قرآن مجید کے مفہوم ومعنویت کو اجاگر کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دوسرے تراجم کی بھی تنقیص وتغلیط نہیں کی اور نہ ہی کسی مترجم کی تحقیر کی ہے بلکہ ایسے بعض تراجم اور ان کی زبان وبیان کو ان کے عہد کے رائج الوقت ادب کی ترجمانی قرار دے کر بھی تحسین فرمائی ہے، جیسے سورۃ النباء کی ابتدائی تین آیتوں کے آٹھوں ترجمہ نگاروں کے تراجم نقل کرنے کے بعد محقق نے تقابلی جائزہ میں لکھا ہے کہ مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا احمد رضا خان بریلوی، مولانا محمود الحسن دیوبندی، مولانا عبدالماجد دریابادی اور مولانا امین احسن اصلاحی نے دوسری آیت کا ترجمہ سادہ خبریہ اسلوب کے تحت کیا ہے جب کہ مولانا منصور نے تیسری آیت کا ترجمہ سادہ خبریہ اسلوب سے کیا ہے لیکن مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور پیر محمد کرم شاہ ازہری نے استفہامیہ اسلوب کے تحت ترجمہ کیا ہے پھر نتیجہ میں مؤخر الذکر سید ابوالاعلیٰ مودودی اور پیر محمد کرم شاہ ازہری کے ترجمہ کی تحسین کرتے ہیں کہ مضمون میں زور اور شدت پیدا کرنے کیلیے خبریہ اسلوب کے مقابلے میں استفہامیہ اسلوب زیادہ بہتر ہوتا ہے، مطلب یہ کہ اگر مؤخر الذکر ترجموں کی تحسین کی گئی ہے تو باقی چھ تراجم کی تغلیط نہیں کی گئی ہے بلکہ سادہ خبریہ اسلوب کو بھی اپنی جگہ درست تسلیم کیا گیا ہے۔

اسی طرح سورۃ النباء کی آیت 4 اور 5 کے آٹھوں منتخب تراجم نقل کرنے کے بعد لفظ ''کلا'' پر نحوی بحث کر کے یہ واضح کیا ہے کہ لفظ ''کلا'' کب ردع، زجر اور نفی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور کب یہ کسی کلام کو مسترد کرنے کیلیے بطور اسم استعمال ہوتا ہے۔ پھر بطور نتیجہ بیان کرتے ہیں کہ مذکورہ نحوی بحث کے بعد مناسب یہ ہے کہ ''کلا'' کا معنی ہرگز نہیں/ایسا نہیں یعنی نفی میں کرنے کے بجائے اثبات میں

کیا جائے جیسا کہ مولانا احمد رضا بریلوی، پیر محمد کرم شاہ الازہری اور مولانا ابو منصور نے کیا ہے۔ نیز سیعلمون کا مفعول صرف پیر محمد کرم شاہ الازہری اور عبدالماجد دریابادی نے متعین کیا ہے، جب کہ پیر محمد کرم شاہ نے تو بھرپور معنویت پیدا کرنے کے لیے سیعلمون کے محذوف کی بھی عقدہ کشائی کر دی ہے۔ اس طرح انہوں نے اپنے ترجمہ میں سارے حسن سمو لیے ہیں۔ چنانچہ محقق نے یہاں بھی اگر پیر محمد کرم شاہ اور عبدالماجد دریابادی کے ترجموں کی تحسین کی ہے تو دیگر تراجم کی اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا۔ بایں ہمہ معلوم یہ ہوا کہ محقق کی نظر ترجمہ کے لفظی حسن پر نہیں بلکہ ان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ کون سا ترجمہ الفاظ قرآنیہ کا حقیقی عکس لیے ہوئے ہے۔ چنانچہ یہاں بھی اصل مقصود قرآن کی معنوی عظمت کو بلند کرنا ہے۔

اسی سورۃ النباء کی آیات 6 تا 17 کے آٹھوں تراجم نقل کرنے کے بعد محقق نے تجزیہ کر کے پہلے تو یہ ملحوظ کیا ہے کہ تیسری آیت میں اسلوب کلام باعتبار الفاظ اگرچہ خبریہ ہو گیا ہے لیکن باعتبار معنی یہ پہلی آیت پر معطوف ہے جیسا کہ سورۃ الم نشرح کا اسلوب ہے یعنی آیت نمبر 2 ووضعنا عنک وزرک لفظاً سادہ خبریہ اسلوب کے تحت ہے لیکن معناً استفہامیہ اسلوب کے تحت ہے، اس حوالے سے ان آٹھوں تراجم میں صرف امین احسن اصلاحی کا ترجمہ استفہامیہ انشائیہ اسلوب پر کیا گیا ہے جو کہ زیادہ مؤثر اور دلنشین ہے مگر دیگر تراجم جو خبریہ اسلوب پر کیے گئے ہیں ان کی افادیت سے بھی صرف نظر نہیں کیا گیا۔

اسی طرح اسی سورۃ کی آیت "وبنینا فوقکم سبعا شدادا ○" کے آٹھوں تراجم کو تحقیق و تجزیہ کی کسوٹی پر پرکھنے کے بعد محقق نے مولانا احمد رضا بریلوی، مولانا محمود الحسن دیوبندی اور مولانا ابو منصور کے لفظ آسمان کے اضافہ کے بغیر ترجموں کو خوب تر قرار دیا ہے اور پھر ان تینوں ترجموں پر قائم ہونے والے ایک اعتراض کا جواب بھی دے دیا ہے کہ بعض ماہرین کے حساب کے مطابق اطراف زمین میں پائے جانے والے خطۂ ہوا کی استقامت، جو ایک سو کلو میٹر سے بھی زیادہ ضخیم ہے وہ ایک پولاد کی چھت کی دس میٹر کی ضخامت کے برابر ہے اور سبعا شدادا کی یہ ایک تفسیر ہے۔ مطلب یہ کہ تینوں مترجمین نے جو بغیر لفظ آسمان کے اضافہ کے ترجمہ کیا ہے تو وہ اس لیے اصح ہے کہ آسمان سبعا شدادا کی تفسیر میں موجود ہے، البتہ دیگر پانچ مترجمین نے لفظ آسمان کے اضافہ سے جو ترجمہ کیا ہے وہ ترجمہ در ترجمہ ہے یعنی یہ تراجم بھی تفسیری ترجمہ ہوتے ہوئے لائق التفات ہے۔

سورۃ التکویر کی آیت 15 تا 18 کے آٹھوں ترجمے نقل کرنے کے بعد محقق نے اپنے تجزیہ میں یہ نشاندہی کی ہے کہ مولانا احمد رضا بریلوی اور مولانا محمود الحسن دیوبندی کے ترجموں میں ستاروں اور

سیاروں کے عدم ذکر کے حوالے سے ایک قدر مشترک ہے جب کہ ان دونوں حضرات کے لفظ عسعس کے ترجمہ میں تاویل ممکن ہے جس کی رو سے مولانا احمد رضا بریلوی کا ترجمہ لائق ترجیح ہے۔ اسی طرح مولانا امین احسن اصلاحی اور سید ابوالاعلیٰ مودودی کے ترجمہ میں بھی ایک قدر مشترک کی نشاندہی کی گئی ہے کہ انہوں نے لفظ "فلا" کا ترجمہ پس نہیں کیا ہے جب کہ قسم سے پہلے اگر "لا" اور "فلا" جس طرح یہاں آیا ہے وہ قسم کی نفی کے لیے نہیں بلکہ مخاطب کے معہود ذہنی کی نفی کے لیے آتا ہے اور اس سے مقصود اس کی تردید ہوتی ہے۔ چنانچہ اس مقام پر سید ابوالاعلیٰ مودودی اور امین احسن اصلاحی کے ترجمے نمایاں ہیں۔ نیز انہی آیات کے ترجمہ میں عبدالماجد دریابادی کی انفرادیت کو بھی نمایاں کیا ہے کہ موصوف نے اقسم اور واللیل کی واؤ قسمیہ کے حوالے سے لفظ قسم کا دو مرتبہ استعمال کیا ہے اور ایسا کرنا قرآن کے لفظی پہلو کی نمائندگی کے عین مطابق ہے۔ مطلب یہ کہ محقق نے اپنی تحقیق کو کسی ایک پلڑے میں مقید نہیں کیا بلکہ قرآن کی معنویت کو آشکارا کر کے اپنے نظریہ کے مطابق جس ترجمہ میں جس زاویہ سے حسن نظر آیا ہے اس حسن کو اجاگر کیا ہے مگر اسی نقطہ نظر سے دوسرے ترجمہ کو قلم کی زد میں لانے کے بجائے دوسرے زاویہ سے اس کی اہمیت و رفعت کو تسلیم کیا ہے یعنی جو ترجمہ جس زاویہ و پہلو سے منفرد تھا اسے اسی پہلو سے منفرد قرار دیا ہے۔

اسی طرح سورۃ المطففین کی آیت 28,27 کے آٹھوں تراجم نقل کرنے کے بعد محقق نے اپنے تجزیہ میں امین احسن اصلاحی اور مولانا ثناء اللہ امرتسری کے ترجموں میں یکسانیت کی نشاندہی کی ہے کہ ان دونوں نے لفظ "بھا" میں ب کو ظرف کے معنی میں لیا ہے جب کہ دیگر چھ مترجمین نے ب کا معنی "سے" لیا ہے۔ پھر بطور نتیجہ بتاتے ہیں کہ دونوں طرح کے ترجمے اگرچہ درست ہیں مگر یہ بات محقق ہے کہ ظرفیت کے لیے ب کا استعمال از روئے قواعد عربیہ بہت معروف ہے۔ پھر جن مترجمین نے ب کا معنی "سے" لیا ہے ان پر امین احسن اصلاحی کے اعتراض کو مسترد کرتے ہوئے محقق نے واضح کیا ہے کہ ہمارے نزدیک صحت ترجمہ کی رو سے دونوں طرح کے تراجم درست ہیں یعنی محقق نے اگر دو تراجم میں موجود دو جہتے حسن کو ترجیح دی ہے تو دیگر تراجم کے حسن صحت کا بھی اقرار کیا ہے، یہی ایک کھرے محقق کی شناخت ہے کہ وہ اپنا وزن کسی ایک پلڑے میں نہیں ڈالتا۔

سورۃ الانشقاق کی آیت 16 کے آٹھوں تراجم نقل کرنے کے بعد محقق نے اپنے مختصر مگر جامع تحقیقی تجزیہ کے پیش نظر یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور مولانا امین احسن اصلاحی نے اپنے ترجموں کا آغاز "پس نہیں" سے جو کیا ہے تو انہوں نے اس اسلوب میں بلاغت کا خیال رکھا یعنی ان

دونوں ترجموں میں "فلا" کی معنویت وافادیت کا بھرپور عکس موجود ہے جب کہ دوسرے پہلو سے مولانا احمد رضا بریلوی، مولانا ثناء اللہ امرتسری اور مولانا محمود الحسن دیوبندی کے تراجم میں لفظ "لشفق" کا ترجمہ کرنے کی ایک نئی قدر مشترک کی نشاندہی کی گئی ہے یعنی ان تینوں حضرات کے قرآنی الفاظ کے مناسب الفاظ میں ترجمہ کرنے کو سراہا گیا ہے۔

سورۃ البروج کی آیات 4 تا 8 کے آٹھوں منتخب تراجم نقل کرنے کے بعد محقق نے کئی زاویوں سے خاص طور پر حرف "اذ" کے حوالے سے جامع تجزیہ کرنے کے بعد مولانا امین احسن اصلاحی کے ترجمہ کو باقی تراجم کے مقابلے میں قرآنی مدعا کے قریب تر قرار دیا ہے کیونکہ صرف اصلاحی صاحب نے ہی مذکورہ آیات کا ترجمہ مستقبل کے اسلوب سے کیا ہے جو کہ قرآن کے مقصدی پہلو سے بھرپور نظر آتا ہے جب کہ دیگر مترجمین نے مذکورہ آیات کا ترجمہ ماضی میں کر کے اس واقعہ کو گذشتہ زمانے کا ایک حصہ بنا دیا ہے۔

اسی طرح مذکورہ سورۃ البروج کی آیت 15 کے آٹھوں تراجم نقل کرنے کے بعد محقق نے لفظ "المجید" کا باعتبار لغت جائزہ لے کر "المجید" کو مشہور قرأت کے مطابق مرفوع ہونے کی بناء پر اوصاف الٰہی سے گردانا ہے۔ اس لحاظ سے عبدالماجد دریابادی، سید ابوالاعلیٰ مودودی، پیر محمد کرم شاہ ازہری، مولانا محمود الحسن دیوبندی اور مولانا ثناء اللہ امرتسری کے تراجم کو ازروئے قواعد وقرأت مشہورہ زیادہ مناسب قرار دیا ہے، کیونکہ "المجید" عرش کی صفت اس وقت ہوگا جب اسے مکسور پڑھا جائے، بصورت مرفوع یہ اوصاف الٰہی سے ہوگا، اس لیے مذکورہ پانچوں تراجم معروف قواعد کے عین مطابق ہیں۔

سورۂ فجر کی آیت 14 کے آٹھوں تراجم نقل کرنے کے بعد محقق نے ترجمہ میں استعمال کیے گئے الفاظ کا باعتبار ادب اور لفظ "مرصاد" کا باعتبار صرف ولغت جائزہ لے کر مولانا احمد رضا خان بریلوی کے ترجمہ کو ہمہ رنگ وجہت معنویت سے لبریز ترجمہ قرار دیا ہے۔

بعد ازاں پانچویں باب میں باعتبار لغت اور کچھ دیگر ضمنی پہلوؤں سے بھی ان منتخب اردو تراجم کا تقابلی جائزہ لیا گیا ہے۔ محقق نے حسب روایت سابقہ اپنے تجزیہ وتحقیق میں کچھ تراجم کی باعتبار قواعد لغت وادب انفرادیت کو نمایاں کیا ہے مگر یہاں بھی دوسرے تراجم کے حسن سے آنکھیں نہیں موند لیں جیسا کہ سورۃ الاعلیٰ کی آیت 6 کے آٹھوں تراجم نقل کر کے پھر ان کا تقابلی تجزیہ کر کے لکھتے ہیں کہ سات مترجمین نے لفظ "سنقرئک" کا ترجمہ پڑھانے سے کیا ہے جو کہ قواعد عربیہ کی رو سے صحیح ہے کیونکہ اس میں حرف خطاب "ک" مفعول بہ ہے اور یہاں مفعول بھی ایک ہی بیان ہوا ہے، اس لیے

اس کا ترجمہ پڑھانے سے کرنا بہتر ہے۔

پھر کہتے ہیں کہ مولانا سید مودودی کا ترجمہ پڑھوانے سے کرنا اگرچہ قواعد عربیہ کے خلاف ہے لیکن اسے غلط اس لیے قرار نہیں دیا جا سکتا کہ عام تفاسیر کے مطابق حضور اکرم ﷺ کو بواسطہ جبرائیل امین علم دیا گیا ہے اور اس کی دلیل یہ آیت ہے "علمہ شدید القوی" یہاں شدید القوی سے مراد حضرت جبرائیل علیہ السلام کو لیا گیا ہے، اس لیے سید مودودی نے ترجمہ پڑھوانے سے کیا ہے جب کہ دیگر حضرات نے حسن بصری کے تتبع میں شدید القوی کو اوصاف الٰہی میں شمار کیا ہے، اس لیے ترجمہ پڑھانے سے کیا ہے۔ علاوہ ازیں اپنے تجزیہ میں مزید کہتے ہیں کہ بقیہ ساتوں تراجم اگرچہ ازروئے قواعد بالکل صحیح ہیں لیکن ازروئے ادب پیر محمد کرم شاہ اور عبدالماجد دریابادی کے تراجم زیادہ موزوں ومنفرد ہیں، کیونکہ ان دونوں حضرات نے حضور ﷺ کے لیے تو، تجھ، تجھے، تم، تمہیں جیسے الفاظ استعمال کرنے کے بجائے لفظ آپ استعمال کیا ہے، غرض کہ محقق نے یہاں بھی قرآن کی معنوی مقصدیت کو اجاگر کرنے والے تراجم کی تحسین کی ہے مگر کسی مترجم یا اس کے ترجمہ کی تغلیط وتحقیر نہیں کی ہے، اسے بالفاظ دیگر یوں کہا جا سکتا ہے کہ محقق اپنے نقطہ نظر سے کہیں ہٹتا ہوا نظر نہیں آتا۔

سورۃ الفجر کی آیت 22 کے آٹھوں تراجم نقل کرنے کے بعد محقق نے بہت ہی جامع تجزیہ کیا ہے۔ اس باب میں چونکہ قرآن کی جامعیت کو واضح کرنے کے لیے اردو تراجم میں لغوی محاسن کا تقابلی جائزہ لیا گیا ہے، اس لیے الفاظ ترجمہ پر نظر عمیق سے توجہ ڈالی گئی ہے۔ چنانچہ محقق اپنے تجزیہ کے بعد بتاتے ہیں کہ مولانا ابو منصور، مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا عبدالماجد دریابادی اور مولانا محمود الحسن دیوبندی نے لفظ "جاء" کا ترجمہ رب کے آنے یا نمودار ہونے سے کیا ہے جب کہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور پیر محمد کرم شاہ ازہری نے "جاء" کا معنی رب کے جلوہ فرمانے سے کیا ہے، اگرچہ ظاہر الفاظ میں رب تعالیٰ کے آنے کا ذکر ہے مگر امر واقعہ یہ ہے کہ رب تعالیٰ آنے جانے سے قطعاً پاک ہے البتہ اس کے جلوہ فرمانے میں کسی کو کلام نہیں اور اس کے شواہد قرآن میں موجود ہیں۔ اس حوالے سے مولانا سید مودودی اور مولانا پیر محمد کرم شاہ ازہری کے ترجموں میں لغوی معنویت ہے لیکن دوسرے پہلو سے کہ یہاں مضاف محذوف ہے اور امام فخر الدین رازی نے اس آیت میں چار محذوف ذکر کیے ہیں جن میں سے لفظ "امر" کو اکثر مفسرین نے تقدیر آیت کے بطور بیان کیا ہے، لہٰذا مضاف محذوف لفظ "امر" کے پہلو سے مولانا احمد رضا خان بریلوی اور مولانا ثناء اللہ امرتسری نے جو ترجمہ کیا ہے وہ بالکل صحیح اور برمحل ہے اگر تیسرے یعنی ادب کے پہلو سے دیکھا جائے تو پیر محمد کرم شاہ ازہری اور عبدالماجد دریابادی کے ترجموں

میں ادب واحترام کی رمق موجود ہے کہ ان دونوں حضرات نے حضور ﷺ کے لیے تیرا، تیرے، تمہارا، تمہارے کے بجائے لفظ آپ کا استعمال کیا ہے۔ مطلب یہ کہ محقق نے یہاں بھی ترجمہ یا مترجم کے بجائے قرآن کی جامعیت کو اجاگر کیا ہے۔

سورۃ البلد کی آیت ایک اور دو کے آٹھوں تراجم نقل کرنے کے بعد محقق نے پہلے تو "لا اقسم" کے حرف لا پر بحث کی ہے، پھر لا منفصل اور لا زائدہ کے معنی ومفہوم کا تقابلی تجزیہ پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس پہلو سے کسی ایک ترجمہ کو راجح قرار دینا یقیناً امر دشوار ہے کیونکہ اگر قسم سے پہلے "لا" کا منفصل آنا عربی کا معروف اسلوب ہے تو اگر "لا" زائدہ بھی ہو تو پھر بھی معنی وہی ہوں گے۔ نیز محقق نے یہ نشاندہی بھی کی ہے کہ سوائے مولانا امین احسن اصلاحی کے باقی جملہ مترجمین نے "وانت" کا مخاطب حضور اکرم ﷺ کی ذات گرامی کو قرار دیا ہے۔ اگرچہ مدعا میں کچھ فرق نہیں، لیکن امین احسن اصلاحی کے ترجمہ میں لفظ تم کا استعمال بچتا نہیں ہے۔ اسی طرح حضور ﷺ کے لیے جن مترجمین نے لفظ تم، تو، تجھ استعمال کیے ہیں ان کے مقابلے میں پیر محمد کرم شاہ ازہری اور مولانا عبدالماجد دریابادی کے ترجمے زیادہ بہتر ہیں کہ انہوں نے حضور ﷺ کے لیے لفظ آپ استعمال کیا ہے۔ مزید تجزیہ میں یہ بھی بتا دیا ہے کہ آیت نمبر 2 کے ترجموں میں مترجمین کافی حد تک الگ الگ ہیں لیکن کسی بھی ترجمہ کو غلط یا راجح قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ ہر ترجمہ قرآن کی بلاغت کے عین تتبع میں ہے۔

سورۃ الشمس کی آیات 5,6,7 کے جملہ منتخب تراجم نقل کرکے محقق نے اپنے تقابلی تجزیہ میں ایک نتیجہ تو یہ نکالا ہے کہ مولانا احمد رضا بریلوی، مولانا سید مودودی، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا ابو منصور، مولانا عبدالماجد دریابادی اور پیر محمد کرم شاہ ازہری نے مذکورہ آیات کے ترجمے ما موصولہ کے اسلوب سے کیے ہیں جب کہ مولانا محمود الحسن دیوبندی اور مولانا امین احسن اصلاحی نے ما مصدریہ کے تحت ترجمہ کیے ہیں۔ علاوہ ازیں محقق نے ما مصدریہ، ما موصولہ، ما بمعنی الذی اور من پر تفصیلی غور وفکر کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ عربی لغت میں "ما" عام طور پر غیر ذوی العقول کے لیے آتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ پر اس کا اطلاق کسی طرح درست نہیں ہے، اس لحاظ سے ما موصولہ کے مقابلے میں ما مصدریہ کے اسلوب کے تحت کیے گئے ترجمے علماء تحقیق کی مطاوعت میں ہیں لہٰذا مولانا محمود الحسن دیوبندی اور مولانا اصلاحی کے ترجمے قرآن کی مقصدی معنویت کے عین مطابق ہیں بایں ہمہ مولانا محمود الحسن دیوبندی نے اگرچہ "ما" کو مصدریہ کے تحت اردو میں سمویا ہے مگر ترجمہ بطور قسم کے کیا ہے جب کہ مولانا اصلاحی نے دعوت فکر وتحقیق اور شہادت وگواہی کے پہلو سے ترجمہ کیا ہے لہٰذا اس حوالے سے امین احسن اصلاحی کے

ترجمہ کا حسن نمایاں ہے۔

اسی سورۃ الشمس کی آیت "فعقروھا" کے تمام منتخب تراجم نقل کرکے محقق نے پہلے لفظ "عقر" کے معنی کو لغات القرآن کے حوالے سے منقح ومبرہن کیا ہے، پھر اسی حوالے سے بطور نتیجہ مولانا سید مودودی اور مولانا عبدالماجد دریابادی کے ترجموں کو بھرپور معنویت کا حامل قرار دیا ہے کیونکہ ان دونوں حضرات نے سادہ اور مختصر الفاظ میں قرآنی مفہوم کو اپنے کامل معنی میں منتقل کرنے کی کوشش کی ہے۔

سورۃ اللیل کی آیات 1,2,3 کے جملہ منتخب تراجم نقل کرکے محقق نے اپنے تجزیہ میں واضح کیا ہے کہ یہاں بھی مولانا محمود الحسن دیوبندی اور مولانا امین احسن اصلاحی نے ما مصدریہ کے تحت ترجمہ کیا ہے جب کہ دیگر مترجمین نے ما موصولہ کے اسلوب میں ترجمہ کیا ہے، اگرچہ پیر محمد کرم شاہ ازہری نے تفسیر تو ما مصدریہ کے تحت کی ہے مگر ترجمہ ما موصولہ کے تحت کیا ہے۔ نیز لفظ قسم اور لفظ شاہد سے کیے گئے ترجموں میں مولانا اصلاحی کے ترجمہ کو اہمیت دی جائے گی گویا محقق نے یہاں مولانا محمود الحسن دیوبندی اور مولانا امین احسن اصلاحی کے ترجموں کو بہتر قرار دیا ہے۔ پھر شہادت وگواہی کے الفاظ سے کیے گئے ترجمہ کے حوالے سے مولانا اصلاحی کے ترجمہ کو بہتر اور وزن دار تسلیم کیا گیا ہے۔

اسی سورۃ اللیل کی آیت 19 کے آٹھوں تراجم نقل کرکے محقق نے اپنے تفصیلی اور جامع تجزیہ میں پہلے تو یہ تسلیم کیا ہے کہ مذکورہ اسلوب کے تحت کیے گئے کسی بھی ترجمہ کو مرجوح قرار نہیں دیا جا سکتا۔ پھر اس اسلوب ترجمہ پر خود ہی ایک اعتراض قائم کرکے بطور نتیجہ بتاتے ہیں کہ امین احسن اصلاحی کا ترجمہ نہ صرف بہتر ہے بلکہ اس میں مقصود قرآن بھی نمایاں ہے۔ نیز محقق اپنے تجزیہ کے بعد بطور نتیجہ یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ مولانا ثناء اللہ امرتسری نے "عندہ" کی "ہ" ضمیر کو اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹایا ہے اور اسی کے تحت ترجمہ کیا ہے جب کہ دیگر مترجمین نے ہ ضمیر کا مرجع "الاتقی" کو بنایا ہے اور اسی کے تحت ترجمہ کیا ہے۔ مولانا امرتسری کا ترجمہ اگرچہ درست ہے لیکن اتنا جامع نہیں ہے کیونکہ قرینہ یہ بتا رہا ہے کہ یہاں ہ ضمیر انسانوں کی طرف راجع ہے جیسا کہ امین احسن اصلاحی نے کی ہے لہٰذا محقق کے نزدیک معنویت اور مقصدیت سے بھرپور ترجمہ امین احسن اصلاحی کا ہے۔

بعد ازاں سورۃ الضحیٰ کی ابتدائی تینوں آیات کے جملہ منتخب تراجم نقل کرکے محقق نے اپنے تجزیہ میں پہلے تو واو قسمیہ پر بحث کی ہے اور اس بحث میں ایک پہلو سے یہ بتایا ہے کہ واو قسمیہ کا ترجمہ قسم سے بھی صحیح ہے اور لفظ شاہد سے بھی صحیح ہے مگر جو دعوت فکر وتحقیق اور مضمون میں زور لفظ شہادت سے

پیدا ہوتا ہے وہ لفظ قسم سے ترجمہ کرنے میں ظاہر نہیں ہوتا۔ پھر لفظ قسم کا معنی باعتبار لغت دلیل وشہادت ثابت کرکے محقق نے خیال ظاہر کیا ہے کہ واؤ قسمیہ کا مضمون اردو کے ترجمہ میں لفظ شاہد سے ادا کرنا انتہائی بلیغ ہے، اس لحاظ سے مولانا امین احسن اصلاحی کا ترجمہ قرآن کے مقصدی پہلو کو اجاگر کرتا ہے۔۔۔۔ اسی طرح تیسری آیت کے لفظ "وَدَّعَكَ" کے ترجمہ میں استعمال کیے گئے اردو الفاظ کا جائزہ لے کر بتاتے ہیں کہ دست بردار ہونے، رخصت کرنے، چھوڑنے اور وداع کرنے جیسے الفاظ اس لفظ ودعک کے تحت اللفظ معنی میں باعتبار لغت استعمال ہو سکتے ہیں مگر مولانا ابو منصور کے الفاظ "دست بردار ہوتے" زیادہ قرین ادب دکھائی دیتے ہیں۔۔۔۔ اسی طرح لفظ "قلٰی" کے جو معنی "ناراض ہونے، بیزار ہونے، خفا ہونے اور مکروہ جاننے" سے کیے گئے ہیں ان میں خفا ہونے اور ناراض ہونے کے مقابلہ میں بیزار ہونے اور مکروہ جاننے کے الفاظ ہماری اردو زبان میں بہت ہی برے اور قبیح جانے جاتے ہیں، پھر بیزار ہونے کے مقابلے میں مکروہ جاننے کو زیادہ سنگین اور سخت سمجھا جاتا ہے، لہٰذا حضور ﷺ سے اس لفظ کی نسبت غیر مناسب ہے۔ مزید یہ کہ ہماری زبان میں لفظ "آپ" کا استعمال قرین ادب ہے۔ اس پہلو سے مولانا عبدالماجد دریابادی اور پیر محمد کرم شاہ کے ترجمے زیادہ بہتر ہیں کہ انہوں نے حضور اکرم ﷺ کے لیے لفظ آپ استعمال کیا ہے۔

سورۃ التین کی آیت نمبر 5 کے تحت تمام منتخب تراجم نقل کرکے محقق نے سب سے پہلے تو لفظ "اسفل" اور "رددناہ" کا نحوی جائزہ لیا ہے اور اس میں بتایا ہے کہ نحوی اعتبار سے امین احسن اصلاحی کا ترجمہ معارف سے پر ہے۔ جس میں مقتضائے قرآن کو ملحوظ رکھ کر فتنۂ جبر وقدر کی جڑ بنیاد سے ہی کاٹ دی ہے۔ بعد ازاں محقق نے "رددناہ" کے مختلف مفاہیم کے لیے مختلف آیات سے شہادتیں پیش کرکے جملہ کی ترکیب کا تفصیلی تجزیہ کرنے کے بعد بتایا ہے کہ مضاف، مضاف الیہ کی ترکیب یہاں خلاف عربیت ہے کیونکہ جب افعل کی اضافت نکرہ کی طرف ہو تو ضروری ہے کہ مضاف الیہ واحد ہو۔ یہاں "سافلین" چاہے ظرف ہو یا حال ہو، لیکن سافلین بھی ایک مستقل حال ہے، اس لیے سافلین جمع ہونے کے باوجود نکرہ آیا ہے۔۔۔ اسی طرح "رددناہ" میں ضمیر تو واحد ہے مگر حال کو بلحاظ معنی جمع لائے ہیں کیونکہ آیت میں انسان سے مراد نوع انسان ہے۔ اس طرح محقق نے اس آیت کے حوالے سے امین احسن اصلاحی کے ترجمہ کی تحسین کی ہے۔

سورۃ البینۃ کی آیت 1 کے آٹھوں تراجم نقل کرنے کے بعد محقق اپنے تفصیلی تجزیہ کے بعد بتاتے ہیں کہ مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا سید مودودی، پیر محمد کرم شاہ ازہری، مولانا ثناء اللہ امرتسری،

عبدالماجد دریابادی اور مولانا ابو منصور نے "من اہل الکتاب" کا ترجمہ من تبعیضیہ سے کیا ہے جبکہ مولانا احمد رضا بریلوی اور مولانا محمود الحسن دیوبندی نے اس کا ترجمہ من بیانیہ سے کیا ہے، پھر تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مولانا سید مودودی اس آیت کی تفسیر تو من بیانیہ سے کرتے ہیں مگر ترجمہ اس کے خلاف من تبعیضیہ سے کرتے ہیں یعنی ان کا ترجمہ خود ان کی تفسیر کے خلاف ہے۔ علاوہ ازیں محقق اپنے تجزیہ میں مزید بتاتے ہیں کہ یہاں اگرچہ من تبعیضیہ اور من بیانیہ دونوں کی گنجائش ہے مگر لغات القرآن کے تتبع میں محقق کے نزدیک من تبعیضیہ کے اسلوب سے کیے گئے ترجمے زیادہ قریب صواب ہے۔

اسی طرح سورۃ العٰدیٰت کی آخری آیت کے جملہ تراجم نقل کرکے محقق اپنے تجزیہ میں واضح کرتے ہیں کہ مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا سید مودودی، پیر محمد کرم شاہ ازہری، مولانا ثناء اللہ امرتسری، عبدالماجد دریابادی اور مولانا ابو منصور نے آیت مذکورہ کا ترجمہ زمانہ مستقبل کے اسلوب سے کیا ہے، جس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو شاید قیامت کے روز ہی اپنے بندوں کے حال سے آگاہی ہوگی۔ ان کے مقابلے میں مولانا محمود الحسن دیوبندی اور مولانا احمد رضا بریلوی کا ترجمہ زمانہ حال کے اسلوب کے تحت ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ آج بھی اپنے بندوں کے احوال سے مکمل واقف ہے اور آئندہ بھی رہے گا۔ اس لحاظ سے زمانہ مستقبل کے اسلوب سے کیے گئے ترجمہ کے مقابلے میں محمود الحسن اور مولانا احمد رضا کے ترجمے راجح اور عقیدۂ اسلامی کے عین مطابق ہیں۔

بعد ازاں چھٹے باب میں مذکورہ جملہ منتخب تراجم کا بلحاظ ادبیت تقابلی جائزہ لیا گیا ہے کہ کون سا ترجمہ اردو زبان کی موزونیت، شائستگی وشگفتگی اور فصاحت کا مرقع ہونے کے ساتھ ساتھ قرآن مجید کی روح اور مقصدیت کا آئینہ دار ہے۔ نیز محقق کو اگر تجزیہ میں کسی اور پہلو سے کوئی ترجمہ منفرد نظر آیا ہے یا اس میں کوئی ندرت سامنے آئی ہے تو ایسے پہلوؤں کو متفرقات کا نام دیا ہے۔ محقق نے اگرچہ تراجم کا متعدد ذیلی پہلوؤں سے جائزہ لیا ہے لیکن طرز استدلال اور اسلوب بیان وہی برقرار رکھا ہے جو گذشتہ پانچ ابواب میں اختیار کیا ہے، مگر سابقہ ابواب کے مقابلے میں اس باب میں زیادہ تفصیل، تعمق اور تفحص سے کام لیا گیا ہے، جیسا کہ سورۃ الضحیٰ کی آیت 7 "ووجدک ضالا فھدی" کے آٹھوں تراجم نقل کرکے محقق سب سے پہلے آیت مذکورہ کے سیاق وسباق کے پہلو سے اس کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ اس آیت میں لفظ "فھدی" کا حق بطور نعت کے اس وقت ادا ہو سکتا ہے، جب "ضالا" کا معنی ایسا کیا جائے جس میں حضور ﷺ کی کسی ضرورت یا طلب کا اظہار ہو۔ مذکورہ جملہ منتخب مترجمین نے

''ضالا'' کا معنی اپنی اپنی پسند اور ذوق کے مطابق کیا ہے اور محقق کے خیال میں سیاق کلام کے تقاضا کے مطابق ان سب مترجمین کا مقصود بھی یہی ہے کہ ''فھدی'' کو بطور ازدیاد نعمت کے لیا جائے۔ اس کے باوجود بعض مترجمین نے اپنے ترجمہ میں نامناسب الفاظ استعمال کیے ہیں جیسے بھٹکتا اور بھٹکا ہوا۔ ایسے الفاظ کی حضور اکرم ﷺ کی طرف نسبت کرنا قطعاً ناجائز اور مقام ادب کے خلاف ہے۔ اسی طرح ناواقف راہ اور بے خبر جیسے الفاظ بھی حضور علیہ السلام کے شایان شان نہیں ہیں البتہ ''ضالا'' کا معنی جو یا بے راہ کرنے میں سیاق کلام کا تقاضا بھی پورا ہو گیا ہے اور اس میں حضور اکرم ﷺ کی تڑپ اور بے قراری کا اظہار بھی ہو یدا ہو گیا ہے۔ اس معنی سے ''فھدی'' کا صحیح محل ''جو یائے راہ'' سے ہی سمجھ میں آ سکتا ہے اور یہ ترجمہ امین احسن اصلاحی کا ہے۔

اسی مذکورہ آیت کے ضمن میں ایک اور ترجمہ کا تجزیہ کرتے ہوئے محقق اپنے زاویہ فکر کا اظہار یوں کرتے ہیں کہ مترجم نے اپنے ترجمہ میں دو مرتبہ لفظ اپنی استعمال کیا ہے اگر پہلی ''اپنی'' سے مراد حضور اکرم ﷺ کی اپنی ذات ہو اور دوسری اپنی سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہو تو پھر مفہوم یہ ہوگا کہ حضور اکرم ﷺ اعلان نبوت سے پہلے اپنی محبت میں کھوئے ہوئے تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ اس تاویل کی روشنی میں آیت اپنے سیاق میں تو صحیح ہو گئی مگر معنوی حسن و کمال سے خالی ہو جائے گی اور اگر دونوں ''اپنی'' سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات کو لیا جائے تو پھر اللہ تعالیٰ کا حضور اکرم ﷺ کو اپنی محبت میں وارفتہ پا کر اپنی طرف راہ دینا تحصیل حاصل ہے اور یہ ازدیاد نعمت ہرگز نہیں ہو سکتی جب کہ آیت کا مضمون ازدیاد نعمت کا متقاضی ہے، یہ ترجمہ مولانا احمد رضا خان بریلوی کا ہے۔

اسی طرح پیر محمد کرم شاہ نے لفظ ''ضالا'' کا معنی تو ویسا ہی کیا ہے جیسا مولانا احمد رضا بریلوی نے کیا ہے جب کہ ''فھدی'' کا ترجمہ پیر صاحب نے ''تو منزل مقصود تک پہنچا دیا'' کر کے قرآن کی معنویت و مقصدیت کی مطاوعت کی ہے۔ اس طرح پیر محمد کرم شاہ کا ترجمہ بہت ہی اعلیٰ اور حضور اکرم ﷺ کے شایان شان ہے۔ نیز محقق نے اپنے جائزہ میں یہ بھی نشاندہی کی ہے کہ مولانا امین احسن اصلاحی اور مولانا ابو منصور نے استفہامیہ اسلوب پر ترجمے کیے ہیں جب کہ دیگر مترجمین نے بیانیہ اسلوب پر ترجمے کیے ہیں۔ اس حوالے سے محقق نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ترجمے وہی اچھے ہیں جو استفہامیہ اسلوب پر کیے گئے ہیں۔

سورۃ الم نشرح کی ابتدائی چار آیتوں کے جملہ منتخب تراجم نقل کر کے محقق نے مختلف زاویوں سے ان کا جامع اور تفصیلی تجزیہ کر کے اپنی رائے اس طرح ظاہر کی ہے کہ مولانا ابو منصور اور مولانا امین

احسن اصلاحی نے ''ووضعنا'' اور ''ورفعنا'' کو آیت نمبر 1 پر عطف کر کے استفہامیہ نگاری کے اسلوب پر ترجمے کیے ہیں جب کہ دیگر مترجمین نے خبریہ اسلوب کے تحت ترجمہ کیا ہے اور یہ بات مسلم ہے کہ انشائیہ اسلوب سے ترجمہ کرنے میں کلام کا اصل زور واضح ہو جاتا ہے۔ دوم یہ کہ مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا سید مودودی اور پیر محمد کرم شاہ نے پہلی اور چوتھی آیت میں موجود لفظ ''لک'' کا معنی اپنے ترجموں میں سمو کر کاملیت کا رنگ بھر دیا ہے۔ جب کہ مولانا ابو منصور اور مولانا احمد رضا بریلوی نے فقط آیت نمبر 4 میں موجود ''لک'' کا معنی کیا ہے یعنی ان دونوں کے ہاں یہ رنگ جزوی ہے۔ سوم یہ کہ مترجمین ''انقض ظھرک'' کا ترجمہ جو (کمر یا پیٹھ توڑنے سے) کیا ہے، وہ محقق کے نزدیک حضور اکرم ﷺ کے شایان شان نہیں ہے، البتہ اس آیت نمبر 3 کا جو ترجمہ پیر محمد کرم شاہ نے کیا ہے وہ حضور اکرم ﷺ اور زبان دونوں کے ادب سے لبریز اور سرشار ترجمہ ہے۔ نیز پیر محمد کرم شاہ اور عبدالماجد دریابادی نے اپنے ترجموں میں حضور اکرم ﷺ کے لیے تمہارا، تمہارے، تیرا، تیرے کے بجائے لفظ آپ استعمال کیا ہے، خلاصہ یہ کہ خبریہ اسلوب پر کیے گئے ترجموں میں پیر محمد کرم شاہ کا ترجمہ سب سے اعلیٰ ہے، جب کہ انشائیہ اسلوب کے تحت مولانا ابو منصور کا ترجمہ مولانا امین احسن اصلاحی کے ترجمہ سے زیادہ جامع ہے۔

سورۃ التکاثر کی آیت 5 تا 7 کے جملہ تراجم نقل کر کے محقق نحوی طور پر جائزہ لے کر بیان کرتے ہیں، تالیف کلام پر غور و تفحص کرنے سے معلوم یہ ہوتا ہے کہ آیت نمبر 5 میں حرف ''لو'' کا جواب محذوف ہے، جسے مولانا احمد رضا خان بریلوی، مولانا سید مودودی، مولانا ثناء اللہ امرتسری اور پیر محمد کرم شاہ ازہری نے اپنے اپنے طریقہ و انداز سے اس محذوف کو اپنے تراجم میں کھولا ہے، جب کہ مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا محمود الحسن دیوبندی اور مولانا ابو منصور نے ''لو'' کے محذوف جواب کا ذکر کیے بغیر ترجمہ کیا ہے۔ پھر ان مؤخر الذکر میں سے مولانا عبدالماجد دریابادی اور مولانا محمود الحسن دیوبندی نے ''لترون الجحیم'' سے اپنے ترجمہ کو پھر سے شروع کیا ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ دونوں حضرات مذکورۃ الصدر چاروں حضرات کی طرح ''لترون الجحیم'' اور آیات مابعد کو ''لو'' کے تحت نہیں مانتے جب کہ امین احسن اصلاحی اور ابو منصور نے ان آیات کو ''لو'' کے تحت مانتے ہوئے ترجمہ کیا ہے بلکہ امین احسن اصلاحی نے تو اپنی تفسیر میں اس طرف واضح اشارہ بھی دیا ہے بایں ہمہ ابو منصور کے ترجمہ سے یہ دعویٰ اخذ ہوتا ہے کہ عین الیقین اس دنیا میں بھی حاصل ہوتا ہے جب کہ امین احسن اصلاحی کے نزدیک عین الیقین کا تعلق عالم آخرت سے ہے یہاں صرف علم الیقین حاصل ہوتا ہے۔ محقق نے مزید شواہد پیش کر کے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اگرچہ ابو منصور کے ترجمہ کی اہمیت اور زور سے چشم

پوشی نہیں کی جا سکتی، لیکن امین احسن اصلاحی کے ترجمہ میں بھرپور معنویت کے باعث اسے راجح قرار دیا جا سکتا ہے۔

سورۃ الفیل کی آیت 4 کے آٹھوں منتخب تراجم نقل کرنے کے بعد محقق نے انتہائی گہری نظر سے ان کا تقابلی جائزہ لیا ہے اور ''بحجارۃ من سجیل'' کے ترجمہ میں مترجمین نے جو مختلف الفاظ استعمال کیے ہیں ان کو الگ سے نقل کر کے پرکھا ہے پھر از خود لفظ سجیل کے از روئے لغت معانی اور تفصیلی تحقیق سپرد قلم کر کے اپنی رائے اس طرح پیش کی ہے کہ سوائے مولانا امین احسن اصلاحی کے باقی جملہ مترجمین کے تراجم میں کنکر اور پتھر کے لفظی فرق کے باوجود ایک قدر مشترک موجود ہے یعنی سب نے ''ترمی'' کا فاعل پرندوں کو قرار دیا ہے۔ جب کہ اصلاحی صاحب نے ''ترمی'' کا فاعل انسانوں کو قرار دے کر صیغہ مخاطب / حاضر میں ترجمہ کیا ہے اور یہ ترجمہ انہوں نے فراہی کے تتبع میں کیا ہے۔ آخر میں محقق بطور نتیجہ ان حضرات کے ترجمہ کو زیادہ قرین صواب قرار دیتے ہیں جنہوں نے پتھر اور کنکر سے ترجمہ کیا ہے۔

سورۃ قریش کی آیت ۱۔۲ کے جملہ تراجم تحریر کر کے محقق نے پہلے تو لغت اور گرامر سے تفصیلی تجزیہ کیا ہے اور پہلا نتیجہ یہ نکالا ہے کہ ''لایلاف'' میں جو پہلا لام ہے وہ عربی محاورہ کے مطابق تعجب کے لیے ہے، یہی قول امام الاخفش، امام کسائی اور امام فراء کا ہے اور ابن جریر نے بھی اسی کو راجح کہا ہے۔ چنانچہ مولانا ثناء اللہ امرتسری نے تینوں ائمہ نحو کی پیروی میں اسی محاورہ کے مطابق ترجمہ کیا ہے جب کہ دیگر ساتوں مترجمین نے اس لام کو لام تعلیل سمجھ کر ترجمہ کیا ہے اور دوسرے ایلاف کو پہلے ایلاف سے بطور بدل لیتے ہوئے جار مجرور ''فلیعبدوا'' کے جملہ سے سمجھا ہے۔ اس طرح محقق کی رائے کے مطابق لام تعلیل کے تحت جو ترجمے کیے گئے ہیں وہ درست ہیں لیکن ان سات ترجموں میں بھی مسلسل مربوط اور کامل فہم عطا کرنے والا ترجمہ ابو منصور کا ہے۔

سورۃ الماعون کی آیت 5 کے آٹھوں تراجم نقل کرنے کے بعد محقق نے نظر عمیق سے تقابلی جائزہ لینے کے بعد یہ ثابت کیا ہے کہ سوائے ابو منصور کے باقی جملہ مترجمین کے تراجم ایک ہی مضمون یعنی نماز کے ظاہر پر مشتمل ہیں جب کہ ابو منصور کا ترجمہ آیت کے مفہوم پر دلالت کرتا ہے یعنی نماز کے مقتضائے حقیقی کو ظاہر کرتا ہے۔ اسی باعث یہ ترجمہ باقی تراجم کے مقابلے میں جاذب توجہ ہے اور اگر آیت نمبر 6 کو اس آیت سے ملا کر پڑھا جائے تو پھر یہ آیت، آیت 5 کو اس طرح مؤکد کرتی ہے کہ اس کا مضمون مزید قابل توجہ ہو جاتا ہے۔ نیز سیاق کلام میں جو محذوف مترشح ہے اسے بھی ابو منصور نے اپنے

ترجمہ میں وا کر دیا ہے۔ مزید براں ابو منصور کے ترجمہ کی تائید ہمیں امین احسن اصلاحی کی تفسیر سے بھی ملتی ہے، گویا محقق نے اس مقام پر ابو منصور کے ترجمہ کو راجح قرار دیا ہے۔

سورۃ اللہب کی پہلی آیت کے آٹھوں منتخب تراجم نقل کر کے محقق نے تفصیلی جائزہ لے کر قرار دیا ہے کہ مولانا احمد رضا خان بریلوی، پیر محمد کرم شاہ ازہری، مولانا ثناء اللہ امرتسری اور مولانا ابو منصور کے ترجموں میں کوسنے اور بد دعا دینے کا مفہوم ملتا ہے جب کہ مولانا محمود الحسن دیوبندی، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا سید مودودی اور مولانا اصلاحی کے ترجموں میں کسی امر کے واقع الحمل ہو جانے کا پتہ چلتا ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ سورۃ اللہب بطور پیش گوئی کے نازل ہوئی تھی جیسا کہ سید مودودی، پیر محمد کرم شاہ ازہری، امین احسن اصلاحی اور عبدالماجد دریابادی نے اپنی اپنی تفاسیر میں اس سورۃ کے بطور پیش گوئی نزول کی تائید کی ہے مگر ان کے تراجم ان کی تفاسیر کے برعکس ہیں۔ چنانچہ محقق اپنی تحقیق کے مطابق رائے دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس آیت میں چونکہ نفس مضمون پیش گوئی پر مشتمل ہے لہٰذا آسان زبان واسلوب میں اس آیت کا ترجمہ یوں کیا جاتا (ابولہب کے ہاتھ ٹوٹیں گے اور وہ خود بھی مرے گا)۔

محقق نے اپنے مقالہ کے اختتامیہ میں طریق استدلال کے علاوہ بھی بہت کچھ لکھا ہے مگر میں اپنی پسند کے صرف دو پیراگراف من وعن نقل کر رہا ہوں جو کہ درج ذیل ہیں:

(۱) علاوہ ازیں اس طرز تحقیق سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں مکتبی ومسلکی تعصب ٹھیک نہیں کیونکہ حق ان تمام ہی کے درمیان دائر وسائر ہے، چنانچہ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ جس مکتب ومسلک کو بھی اختیار کریں یا جس مترجم کو بھی پسند کریں، اسے فہم قرآنی کا فقط ایک ذریعہ قرار دیں، حرف آخر یا عین حق وصواب نہ سمجھیں۔

(۲) چنانچہ اس مقالہ میں ہم نے ثابت کیا ہے کہ فہم قرآنی کیلئے کسی ایک ترجمہ کو کافی قرار نہیں دیا جا سکتا اور یہ کہ قرآن کا بہتر سے بہتر اور جامع وکامل ترجمہ کرنے کی کوششیں جاری رہنی چاہئیں تاکہ کلام الٰہی سے اخذ واستفادہ کرنے والے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ ہدایت ومعرفت حاصل کر سکیں۔

بہر حال یہ مقالہ اعلیٰ قسم کے کاغذ پر طبع ہوا ہے اور انتہائی خوبصورت ٹائٹل سے مزین ہے جو کہ ناشر کے حسن ذوق کا آئینہ دار ہے۔ قرآن فہمی کا ذوق رکھنے والے قارئین کو اس مقالے کا ضرور مطالعہ کرنا چاہئے۔

سیدنا نوح علیہ السلام کی مختصر سرگزشت

مولانا عبدالکریم اثری
(صاحب تفسیر عروۃ الوثقی)

نوح علیہ السلام، آدم علیہ السلام کے بعد پہلے ''نبی'' ہیں جن کو ''رسالت'' سے نوازا گیا۔ چنانچہ صحیح مسلم باب شفاعت جلد اول صفحہ ۹۷، ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں کہ ''یا نوح انت اول الرسل الی الارض '' کہ اے نوح علیہ السلام آپ کو زمین پر سب سے پہلا رسول بنا کر بھیجا گیا۔

ماہرین علم الانساب نے نوح علیہ السلام کو ''لامک'' کا بیٹا لکھا ہے۔ اور آپ ﷺ کا سلسلہ نسب آٹھویں پشت میں شیث بن آدم علیہ السلام سے ملایا ہے اور مدت درمیان خلق آدم علیہ السلام و ولادت نوح علیہ السلام ۱۰۵۶ سال بتائی ہے لیکن اس کی حقیقت تخمینہ وقیاس کے سوا کچھ نہیں ہے۔

قرآن کریم میں سیدنا نوح علیہ السلام کا واقعہ اجمالاً یا تفصیلاً تینتالیس جگہ بیان ہوا ہے۔ جس میں زیادہ تفصیل کے ساتھ سورۂ ہود، سورۂ الشعراء اور سورۂ نوح میں بیان کیا گیا ہے اور مجموعی طور پر جن سورتوں میں ذکر کیا گیا ہے ان کی تفصیل درج ذیل ہے:

(آل عمران ۳:۳۳)، (النساء ۴:۱۶۳)، (الانعام ۶:۸۴)، (الاعراف ۷:۵۹، ۶۹)، (التوبہ ۹:۷۰)، (یونس ۱۰:۷۱)، (ہود ۱۱:۲۵، ۸۹)، (ابراہیم ۱۴:۹)، (الاسراء ۱۷:۳، ۱۷)، (مریم ۱۹:۵۸)، (الانبیاء ۲۱:۷۶)، (الحج ۲۲:۴۲)، (المومنون ۲۳:۲۳)، (الفرقان ۲۵:۳۷)، (الشعراء ۲۶:۱۰۵، ۱۱۶)، (العنکبوت ۲۹:۱۴)، (الاحزاب ۳۳:۷)، (الصافات ۳۷:۷۵، ۷۹)، (ص ۳۸:۱۲)، (المومن ۴۰:۵، ۳۱)، (الشوریٰ ۴۲:۱۳)، (الذاریات ۵۱:۴۶)، (النجم ۵۳:۵۲)، (القمر ۵۴:۹)، (الحدید ۵۷:۲۶)، (التحریم ۶۶:۱۰)، (نوح ۷۱:۱تا۲۶)

سیدنا نوح علیہ السلام کی بعثت سے قبل تمام قوم اللہ تعالیٰ کی توحید اور صحیح اسلامی روشنی سے یکسر نا آشنا ہو چکی تھی اور حقیقی الٰہ کی جگہ خود ساختہ بتوں نے لے لی تھی۔ چنانچہ غیر اللہ کی پرستش اور اصنام پرستی ان کا شعار تھا۔ ان لوگوں کی رشد و ہدایت کے لئے اللہ تعالیٰ نے ان ہی میں سے ایک ہادی و رہنما مبعوث فرما دیا جس کا نام نوح علیہ السلام تھا۔

نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو راہ حق کی طرف پکارا اور اسلام کی دعوت دی لیکن قوم نے نہ مانا اور آپ ﷺ سے نفرت کی اور حقارت کی نظر سے دیکھا خصوصاً قوم کے سرداروں نے ان کی تکذیب کی اور تعجب کیا کہ جس شخص کو نہ ہم پر دولت و ثروت میں برتری ہے اور نہ ہی انسانیت کے رتبہ سے برتر کوئی فرشتہ وغیرہ ہے اس کو کیا حق ہے کہ وہ ہمارا پیشوا بنے اور ہم اس کے احکام کی تعمیل کریں اور اپنے معبودوں کو چھوڑ دیں جن کو ہمارے آباؤ اجداد مانتے چلے آرہے ہیں۔ کیا وہ سارے کے سارے غلط تھے اور ایک یہی سچا انسان ہے؟''

خصوصاً جب انہوں نے دیکھا کہ قوم کے غریب اور کمزور افراد نے نوح علیہ السلام کی دعوت کو قبول کیا ہے تو متغیرانہ انداز میں بڑی حقارت سے کہتے کہ ''ہم ان کی طرح نہیں ہیں کہ تیرے تابع فرمان بن جائیں اور تجھ کو اپنا مقتدا مان لیں۔'' وہ سمجھتے تھے کہ یہ کمزور اور پست لوگ جو نوح علیہ السلام کے اندھے مقلد ہیں نہ یہ ذی رائے ہیں اور نہ ہی ذی شعور کہ حقیقت حال کو سمجھ لیتے اور اگر وہ نوح علیہ السلام کی بات کی طرف توجہ بھی دیتے تو ان سے اصرار کرتے کہ پہلے ان پست اور غیر افراد قوم کو اپنے پاس سے نکال دے تب ہم تیری بات سنیں گے کیونکہ ہم کو ان سے گھن آتی ہے اور ہم اور یہ لوگ ایک جگہ نہیں بیٹھ سکتے۔

نوح علیہ السلام ان کا ایک ہی جواب دیتے کہ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ اللہ کے مخلص بندے ہیں اگر میں ان کے ساتھ ایسا معاملہ کروں جس کے تم خواہش مند ہو تو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے میرے لئے کوئی جائے پناہ نہیں ہے۔ میں اس کے درد ناک عذاب سے ڈرتا ہوں۔ اس کے ہاں اخلاص کی قدر ہے امیر و غریب کا وہاں کوئی سوال نہیں ہے اور فرمایا کہ میں تمہارے پاس اللہ کی ہدایت کا پیغام لے کر آیا ہوں نہ میں نے غیب دانی کا دعویٰ کیا ہے اور نہ فرشتہ ہونے کا۔ میں اللہ کا رسول ہوں اور دعوت و ارشاد میرا مقصود و منصب الٰہی ہے۔ مجھے سرمایہ داری یا بلندی و غیب دانی یا فرشتہ ہونے سے کیا واسطہ؟ اور یہ کمزور و نادار افراد قوم جو اللہ پر سچے دل سے ایمان لائے تمہاری نگاہ میں اس لئے حقیر و ذلیل ہیں کہ وہ تمہاری طرح صاحب دولت و مال نہیں ہیں اور اس لئے تمہارے خیال میں یہ ''خیر'' حاصل کر سکتے

ہیں اور نہ سعادت کیونکہ یہ دونوں چیزیں دولت وحشمت کے ساتھ ہیں نہ کہ محبت واخلاص کے ساتھ۔

نوح علیہ السلام نے فرمایا کہ یاد رکھو کہ اللہ کی سعادت و ''خیر'' کا قانون ظاہری دولت و حشمت کے تابع نہیں ہے نہ اس کے یہاں سعادت وہدایت کا حصول دولت اور سرمایہ کی رونق کے زیر اثر ہے بلکہ اس کے برعکس طمانیت نفسی، رضاء الٰہی، خشوع قلب اور اخلاص نیت وعمل پر موقوف ہے یہی نہیں بلکہ اس سے آگے بڑھ کر نوح علیہ السلام نے اللہ کے حکم سے اس بات کا اعلان بھی کیا کہ لوگو! مجھ کو اپنی اس ابلاغ دعوت وارسال ہدایت میں نہ تمہارے مال کی خواہش ہے نہ جاہ ومنصب کی، نہ میں اجرت کا طلب گار ہوں، اس خدمت کا حقیقی اجر وثواب اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے اور وہی بہترین قدردان ہے، جیسا کہ آپ پیچھے اس سورۂ ہود میں پڑھ چکے ہیں کہ قوم کے ان سرداروں نے جنہوں نے کفر کی راہ اختیار کی تھی کہا:

''ہم تو تم میں اس کے سوا کوئی بات نہیں دیکھتے کہ ہماری ہی طرح کے ایک آدمی ہو اور جو لوگ تمہارے پیچھے چلے ہیں ان میں بھی ان لوگوں کے سوا کوئی دکھائی نہیں دیتا جو ہم میں کمینے ہیں اور بے سوچے سمجھے تمہارے پیچھے ہو لئے ہیں۔ ہم تو تم لوگوں میں اپنے سے کوئی برتری نہیں پاتے بلکہ سمجھتے ہیں کہ تم جھوٹے ہو۔''

نوح علیہ السلام نے کہا ''اے میری قوم کے لوگو! تم نے بھی اس بات پر بھی غور کیا کہ اگر میں اپنے پروردگار کی طرف سے ایک دلیل روشن پر ہوں اور اس نے اپنے حضور سے ایک رحمت مجھے بخش دی ہے (یعنی راہ حق دکھا دی ہے) مگر وہ تمہیں دکھائی نہ دے تو (میں اس کے سوا کیا کر سکتا ہوں جو کر رہا ہوں ؟) کیا ہم جبراً تمہیں دکھا دیں حالانکہ تم اس سے بیزار ہو؟ ''لوگو! جو کچھ میں کہہ رہا ہوں تو اس پر مال و دولت کا تم سے طالب نہیں میری خدمت کی مزدوری جو کچھ ہے صرف اللہ پر ہے اور یہ بھی سمجھ لو کہ جو لوگ ایمان لائے ہیں (وہ تمہاری نگاہوں میں کتنے ذلیل ہوں گے لیکن) میں ایسا کرنے والا نہیں کہ اپنے پاس سے انہیں ہنکا دوں انہیں بھی اپنے پروردگار سے (ایک دن) ملنا ہے (اور وہ ہم سب کے اعمال کا حساب لینے والا ہے) لیکن (میں تمہیں سمجھاؤں تو کس طرح سمجھاؤں ؟) میں دیکھتا ہوں کہ تم ایک جماعت ہو (حقیقت سے) جاہل۔

اور اے میری قوم کے لوگو! مجھے بتلاؤ اگر میں ان لوگوں کو اپنے پاس سے نکال باہر کروں (اور اللہ کی طرف سے مواخذہ ہو جس کے نزدیک ایمان وعمل ہے نہ کہ تمہاری گھڑی ہوئی شرافت ورذالت) تو اللہ کے مقابلہ میں کون ہے جو میری مدد کرے گا؟ (افسوس تم پر!) کیا تم غور نہیں کرتے؟ اور دیکھو میں تم

سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں، نہ یہ کہتا ہوں کہ میں غیب کی باتیں جانتا ہوں، نہ میرا یہ دعویٰ ہے کہ میں فرشتہ ہوں۔ میں یہ بھی نہیں کہتا کہ جن لوگوں کو تم حقارت کی نظر سے دیکھتے ہو اللہ انہیں کوئی بھلائی نہیں دے گا (جیسا کہ تمہارا خیال ہے) اللہ ہی جانتا ہے جو کچھ ان لوگوں کے دلوں میں ہے اگر میں (تمہاری خواہش کے مطابق ایسا کہوں تو جو بھی ایسی بات کہے میں ظالموں میں سے ہو گیا۔''

(سورۂ ہود ۱۱: ۲۷ تا ۳۱)

مختصر یہ کہ نوح علیہ السلام نے انتہائی کوشش کی کہ بدبخت قوم سمجھ جائے اور رحمت الٰہی کی آغوش میں آجائے مگر قوم نے نہ مانا اور جس قدر اس جانب سے تبلیغ حق میں جدوجہد ہوئی اسی قدر قوم کی جانب سے بغض وعناد میں سرگرمی کا اظہار ہوا اور ایذا رسانی اور تکلیف دہی کے تمام وسائل کا استعمال کیا گیا اور ان کے بڑوں نے عوام سے صاف صاف کہہ دیا کہ تم کسی طرح اپنے معبودوں یعنی ود، سواع، یغوث، یعوق اور نسر کی پرستش کو نہ چھوڑو جو کہ ہماری قوم کے بزرگ تھے اور ان کے مجسمے (بت) ان کی یاد کو تازہ رکھنے کے لئے آج بھی ہمارے پاس موجود ہیں۔

اس بحث کو سورۂ نوح میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اس سے بلاشبہ ہدایت وضلالت کے اہم مسائل کو آشکار کر دیا گیا ہے، چنانچہ ارشاد الٰہی کا ترجمہ اس طرح ہے کہ:

''ہم نے نوح علیہ السلام کو اس کی قوم کی طرف بھیجا (اس ہدایت کے ساتھ) کہ اپنی قوم کے لوگوں کو خبردار کر دے، اس سے پہلے کہ ان کے پاس ایک دردناک عذاب آئے۔ اس نے کہا اے میری قوم کے لوگو! میں تمہارے لئے ایک صاف صاف خبردار کر دینے والا (پیغمبر) ہوں (تم کو آگاہ کرتا ہوں) کہ اللہ کی بندگی کرو اور اس سے ڈرو اور میری اطاعت کرو، اللہ تمہارے گناہوں سے درگزر فرمائے گا اور تمہیں ایک مقرر وقت تک باقی رکھے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کا مقرر کیا ہوا وقت جب آجاتا ہے تو پھر ٹالا نہیں جاتا، کاش تمہیں اس کا علم ہو''۔ (نوح ۷۱: ۱ تا ۴)

اس طرح نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو آگاہ کر دیا کہ جن گمراہیوں اور اعتقادی واخلاقی خرابیوں میں وہ مبتلا ہیں وہ ان کو اللہ کے عذاب کا مستحق بنا دیں گی اور اگر وہ ان سے باز نہ آئے تو اس کا نتیجہ یقیناً ان کی تباہی وبربادی ہوگا۔ اس میں گویا تین باتیں تھیں جو سیدنا نوح علیہ السلام نے اپنی رسالت کا آغاز کرتے ہوئے اپنی قوم کے سامنے بحکم الٰہی پیش کیں۔ ایک اللہ کی بندگی کرو، دوسرے تقویٰ اختیار کرو اور تیسرے رسول کی اطاعت بجالاؤ۔

اللہ کی بندگی کا مطلب یہ تھا کہ دوسروں کی بندگی اور عبادت چھوڑ کر صرف اور صرف اللہ ہی

کو اپنا معبود تسلیم کر کے اس کی پرستش کرو اور اس کے احکام بجالاؤ۔ تقویٰ کا مطلب یہ تھا کہ ان کاموں سے پرہیز کرو جو اللہ کی ناراضگی اور اس کے غضب کا موجب ہیں اور اپنی زندگی میں وہ روش اختیار کرو جو اللہ کا ڈر رکھنے والے لوگوں کو اختیار کرنی چاہیے۔ رہی تیسری بات کہ "میری اطاعت کرو"۔ تو اس کا مطلب یہ تھا کہ ان احکام کی اطاعت کرو جو اللہ کا رسول ہونے کی حیثیت سے تمہیں دیتا ہوں۔ انجام کار جب قوم کی اکثریت نے آپ کی ایک نہ سنی یعنی ہر بات کو ان سنی کر دیا تو نوح علیہ السلام نے بارگاہ ایزدی میں عرض کیا:

"اے میرے رب! میں نے اپنی قوم کے لوگوں کو شب و روز پکارا مگر میری پکار نے ان کے فرار ہی میں اضافہ کیا اور جب بھی میں نے ان کو بلایا تاکہ تو انہیں معاف کر دے تو انہوں نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں اور اپنے کپڑوں سے منہ ڈھانک لئے اور اپنی روش پر اڑ گئے اور بڑا ہی تکبر کیا۔ پھر میں نے ان کو ہانک پکار کر دعوت دی اور میں نے ان کو اعلانیہ بھی تبلیغ کی اور چپکے چپکے بھی سمجھایا۔ میں نے کہا اپنے رب سے معافی مانگو، بلاشبہ وہ بڑا معاف کرنے والا ہے۔ وہ تم پر آسمان سے خوب بارشیں برسائے گا۔ تمہیں مال اور اولاد سے نوازے گا، تمہارے لئے باغات پیدا کرے گا اور تمہارے لئے نہریں جاری کر دے گا۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ اللہ کے لیے تم کسی وقار کی توقع نہیں رکھتے حالانکہ اس نے طرح طرح سے تم کو بنایا ہے، کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ نے کس طرح سات آسمان تہ بہ تہ بنائے اور ان میں چاند کو نور اور سورج کو چراغ بنایا؟ اور اللہ نے تم کو زمین سے عجیب طرح اگایا پھر وہ تمہیں اس زمین میں واپس لے جائے گا اور اس سے یکا یک تم کو نکال کھڑا کرے گا اور اللہ نے زمین کو فرش کی طرح تمہارے لئے بچھا دیا تاکہ تم اس کے اندر کھلے راستوں میں چلو۔ نوح علیہ السلام نے کہا اے میرے رب! انہوں نے میری بات رد کر دی اور ان (رئیسوں) کی پیروی کی جو مال اور اولاد پا کر اور زیادہ نامراد ہو گئے ہیں۔ ان لوگوں نے بڑا بھاری مکر کا جال پھیلا رکھا ہے، انہوں نے کہا کہ ہرگز نہ چھوڑو "ود" "سواع" اور "یغوث" "یعوق" اور "نسر" کو انہوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کیا ہے اور تو بھی ان ظالموں کو گمراہی کے سوا کسی چیز میں ترقی نہ دے۔ اپنی خطاؤں کی بنا پر ہی وہ غرق کئے گئے اور آگ میں جھونک دیئے گئے۔ پھر انہوں نے اپنے لئے اللہ سے بچانے والا کوئی مددگار نہ پایا اور نوح علیہ السلام نے کہا "اے میرے رب! ان کافروں میں سے کوئی زمین پر بسنے والا نہ چھوڑ اگر تو نے ان کو چھوڑ دیا تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور ان کی نسل سے جو بھی پیدا ہوگا بدکار اور سخت کافر ہی ہوگا۔" (نوح ۷۱: ۵ تا ۲۷)

اس جگہ قرآن کریم میں نوح علیہ السلام کی قوم کے جس مکر کا ذکر کیا گیا ہے اس سے مراد کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ اس سے مراد قوم کے ان سرداروں اور پیشواؤں کے وہ فریب ہیں جن سے وہ اپنی قوم کے عوام کو حضرت نوح علیہ السلام کی تعلیمات کے خلاف بہکانے کی کوشش کرتے تھے۔ مثلاً وہ کہتے تھے کہ نوح علیہ السلام تمہی جیسا ایک آدمی ہے، کیسے مان لیں کہ اس پر اللہ کی طرف سے وحی آتی ہے؟ (الاعراف ۷: ۶۳، ہود ۱۱: ۲۷) نوح کی پیروی تو ہمارے اراذل نے بے سوچے سمجھے قبول کر لی ہے، اگر اس کی بات میں کوئی وزن ہوتا تو قوم کے اکابر اس پر ایمان لاتے۔ (ہود ۱۱: ۲۷) اللہ کو اگر کوئی رسول بھیجنا ہوتا تو کوئی فرشتہ بھیجتا (المومنون ۲۳: ۲۴) اگر یہ شخص اللہ کا بھیجا ہوا ہوتا تو اس کے پاس خزانے ہوتے، اس کو علم غیب ہوتا اور یہ فرشتوں کی طرح تمام انسانی حاجات سے بے نیاز ہوتا۔ (ہود ۱۱: ۳۱) نوح اور اس کے پیروؤں میں آخر کونسی کرامت نظر آتی ہے جس کی بنا پر اس کی فضیلت مان لی جائے۔ (ہود ۱۱: ۲۷) یہ شخص دراصل تم پر اپنی سرداری جمانا چاہتا ہے۔ (المومنون ۲۳: ۲۴) اور اس شخص پر کسی جن کا سایہ ہے جس نے اسے دیوانہ بنا دیا ہے۔ (المومنون ۲۳: ۲۵) آپ غور کریں گے تو قریب قریب یہ ساری باتیں وہی ہیں جن سے قریش کے سردار ہمارے نبی اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف لوگوں کو بہکایا کرتے تھے اور آج بھی یہ ساری باتیں رؤسائے قوم خواہ وہ مذہبی پیشوا ہوں یا سیاسی لیڈر سب پر من و عن صادق آتی ہیں لیکن ان وقت کے مذہبی اور سیاسی رہنماؤں کا نام لینا اس وقت سے بھی زیادہ مشکل ہے کیونکہ وہ مذہبی اور سیاسی راہنما اعتقادی اور عملی دونوں حالات میں مختلف تھے اور اس وقت یہ سارے کے سارے اعتقادی لحاظ سے مسلمان کہلاتے ہیں اور عملی طور پر ان لوگوں سے بھی گئے گزرے ہیں اس لئے ان کا نام لینا لوہے کے چنے چبانے کے مترادف ہے۔

اس جگہ نوح علیہ السلام کے وقت کے جن پانچ معبودان باطلہ کا ذکر قرآن کریم نے کیا ہے وہ بالکل وہی ہے جنہیں بعد میں اہل عرب نے بھی پوجنا اور پکارنا شروع کر دیا تھا اور آغاز اسلام کے وقت عرب میں بھی جگہ جگہ ان کے مندر اور معبد خانے بنے ہوئے تھے۔ بعید نہیں کہ طوفان میں جو لوگ بچ گئے تھے ان کی زبان سے بعد کی نسلوں نے قوم نوح علیہ السلام کے قدیم معبودوں کا ذکر سنا تھا اور جب از سر نو ان کی اولاد میں جاہلیت پھیلی تو انہی معبودوں کے بت بنا کر انہوں نے پھر پوجنا شروع کر دیا تھا۔

چنانچہ اس وقت "ود" قبیلہ قضاعہ کی شاخ بنی کلب بن وبرہ کا معبود تھا جس کا استھان انہوں نے دومۃ الجندل میں بنا رکھا تھا۔ عرب کے قدیم کتبات میں "ودم ابم" لکھا ہوا ملتا ہے۔ کلبی کا بیان ہے کہ اس کا بت ایک نہایت عظیم الجثہ مرد کی شکل کا بنا ہوا تھا۔ قریش کے لوگ بھی اس کو معبود مانتے تھے اور

اس کا نام ان کے ہاں "ود" تھا۔ ان کے نام پر تاریخ میں ایک شخص کا نام "عبدود" ملتا ہے۔

"سواع" قبیلہ ہذیل کی دیوی تھی اور اس کا بت عورت کی شکل کا بنایا گیا تھا۔ تبوع کے قریب رباط کے مقام پر اس کا معبد واقع تھا۔

"یغوث" قبیلہ طے کی شاخ انعم اور قبیلہ مرحج کی بعض شاخوں کا معبود تھا۔ مذحج والوں نے یمن اور حجاز کے درمیان "جرش" کے مقام پر اس کا بت نصب کر رکھا تھا جس کی شکل شیر کی تھی۔ قریش کے لوگوں میں بھی بعض کا نام عبد یغوث ملتا ہے۔

"یعوق" یمن کے علاقہ ہمدان میں قبیلہ ہمدان کی شاخ "خیوان" کا معبود تھا اور اس کا بت گھوڑے کی شکل کا تھا۔

"نسر" حمیر کے علاوہ میں قبیلہ حمیر کی شاخ آل ذوالکلاع کا معبود تھا اور "بلخع" کے مقام پر اس کا بت نصب تھا جس کی شکل گدھ کی تھی۔ سبا کے قدیم کتبوں میں اس کا نام "نسور" لکھا ہے اور اس کے مندر کو وہ لوگ "بیت نسور" اور اس کے پجاریوں کو اہل نسور کہتے تھے۔ قدیم مندروں کے جو عرب اور اس کے متصل علاقوں میں پائے جاتے ہیں ان میں سے بہت سے مندروں کے دروازوں پر گدھ کی تصویر بنی ہوئی ہے۔

اس جگہ بعض مفسرین اور قصص القرآن کے مرتبین نے اعتراض کیا نوح علیہ السلام کی اس دعا کا ذکر کیا ہے جو سورہ نوح کی آیت ۲۶ میں مذکور ہے:

"اے میرے رب! ان کافروں میں سے کوئی اس زمین پر بسنے والا نہ چھوڑ اگر تو نے ان کو چھوڑا تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے۔"

جس کے اثر سے ساری قوم تباہ ہوگئی حالانکہ نبی رحیم و کریم ہوتا ہے، لہٰذا آپ نے قوم کی ہدایت کی دعا کے بجائے اس کی ہلاکت کی دعا کردی۔ حالانکہ یہ بات صحیح نہیں۔ چنانچہ صحیح بخاری، صحیح مسلم اور دوسری کتب احادیث میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ:

کانی انظر الی النبی ﷺ یحکی نبیا من الانبیاء ضربہ قومہ فادمرہ وھو یمسح الدم ویقول اللھم اغفر لقومی فانھم لا یعلمون۔ (فتح الباری شرح صحیح بخاری، پارہ ۱۴، ص ۲۹۵)

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے گزشتہ نبیوں میں سے کسی نبی کا ذکر کیا تو فرمایا کہ اسے قوم نے مار مار کر خون آلود کردیا، تب بھی اس اللہ کے بندے کی زبان سے یہی سنا گیا کہ اے اللہ! میری قوم کو ہدایت فرما اور اس کو بخش دے کہ وہ نادان ہیں مجھے (بحیثیت رسالت) وہ پہچانتے نہیں ہیں۔

اس پر امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

ھذا النبی الذی جری لہ ما حکاہ النبی ﷺ من المتقدمین وقد جری لنبینا نحو ذلک یوم احد۔ (فتح الباری شرح صحیح بخاری، پارہ ۱۴، ص ۲۹۵)

ترجمہ: "یہ نبی جس کا ذکر ہوا کوئی گزشتہ نبی ہے، لیکن ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ جنگ احد میں بالکل ایسا ہی ہوا"۔

بخاری کی زیر نظر حدیث کی شرح میں حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فتح الباری جلد ۱۴ ص ۲۹۵ میں فرماتے ہیں کہ:

"لم اقف علی اسم ھذا النبی صریحا ویحتمل ان یکون ھو نوح علیہ السلام"

مجھے اس نبی کا نام صریحاً معلوم نہیں ہوا لیکن احتمال یہی ہے کہ یہ نوح علیہ السلام کا واقعہ ہے لیکن اس کی وضاحت دوسری جگہ اس طرح موجود ہے کہ:

قال کانوا یضربون نوحا حتی یغشی علیہ فاذا افاق قال رب اغفر لقومی فانھم لا یعلمون۔

"نوح علیہ السلام کو اتنا مارا جاتا کہ وہ بے ہوش ہوجاتے پھر جب اس کو افاقہ ہوتا تو ان کی زبان مبارک پر یہی ہوتا کہ اے اللہ! میرے رب! میری قوم کو بخش دے کہ وہ نادان ہیں مجھے پہچانتے نہیں (کہ میں اللہ کا رسول ہوں)"۔ (در منثور، ج ۳ ص ۹۲، بحوالہ ابن عساکر عن مجاہد)

ایک جگہ اس طرح تحریر ہے کہ:

قال ان کان نوح یضربہ قومہ حتی یغمی علیہ ثم یفوق فیقول اھد قومی فانھم لا یعلمون۔ (در منثور ج ۳ ص ۹۲ بحوالہ کتاب الزہد امام احمد و ابن ابی شیبہ و ابن ابی عساکر و ابو نعیم عن عبید اللہ بن عمیر اللیثی)

ایک جگہ اس طرح ہے کہ:

قال شقیق قال عبداللہ لقد رایت النبی ﷺ وھو یمسح الدم من وجہ وھو یحکی نبیا من الانبیاء وھو یقول اللھم اھد قومی فانھم لا یعلمون۔

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ایک اسلامی جنگ (احد) میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا چہرہ مبارک زخمی ہوگیا جس سے خون بہنے لگا تو آپ ﷺ اپنا خون صاف فرماتے اور ساتھ ساتھ حکایتاً یہ فرماتے تھے کہ آخر پچھے نبیوں کے ساتھ تو شروع ہی سے یہ ہوتا آیا ہے۔ چنانچہ نوح علیہ السلام کے ساتھ بھی ایسا ہوا تھا، انہوں نے صبر سے کام لیا اور مجھے بھی صبر سے کام لینا ہے۔

رہی یہ دعا جس کا ذکر اس جگہ یعنی سورۂ نوح میں ہے تو یہ اللہ تعالیٰ کے اس اعلان کے بعد کی

ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے نوح علیہ السلام سے مخاطب ہو کر فرمایا تھا کہ:

وأوحی الی نوح انه لن یومن من قومک الا من قد امن فلا تبتئس بما کانوا یفعلون

"اور نوح علیہ السلام پر وحی کی گئی کہ تیری قوم میں سے جو لوگ ایمان لا چکے ہیں ان کے سوا اب کوئی ایمان لانے والا نہیں ہے۔ بس جو کچھ یہ کر رہے ہیں اس پر (بے کار کو) غم نہ کھا۔" (ہود ۱۱:۳۶)

اس طرح جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے اعلان کر دیا گیا تو نوح علیہ السلام نے بھی اس کی تائید میں بارگاہ خداوندی میں وہ دعا ارشاد فرمائی، جس کا ذکر اس جگہ موجود ہے لیکن مفسرین میں سے معترضین حضرات نے اس طرف دھیان نہیں دیا ورنہ ان پر بات صاف واضح ہو جاتی اور وہ کبھی اعتراض نہ کرتے کیونکہ نوح علیہ السلام کی یہ قوم کے حق میں بددعا نہیں بلکہ فیصلہ الٰہی کی تائید کی جا رہی ہے کہ اے رب العالمین جو تیرا فیصلہ ہے وہ بالکل حق ہے کہ ان کے ہاں جو بچہ بھی پیدا ہوگا اس کی راہ انہی کی ہوگی۔ اب اس قوم کا زندہ رہنا خود اس کے حق میں بھی مفید ہونے کی بجائے نقصان ہی کا باعث ہے کہ یہ لوگ وقت کے ساتھ اپنے گناہوں میں مزید اضافہ ہی کریں گے۔ ان سے کسی خیر کی توقع نہیں کی جا سکتی اس لئے کہ اے اللہ! تیرا کیا ہوا فیصلہ کبھی خطا نہیں ہوتا اور نہ ہی تو اس کو خطا ہونے دیتا ہے اس لئے کہ تو ہر چیز پر قادر ہے اور تیرے قبضہ قدرت سے کوئی چیز باہر نہیں پھر تیرے فیصلہ کے خلاف کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟ اس لئے معترضین کا یہ اعتراض صحیح نہیں ہے۔ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان اقدس نے خود اس کی تردید فرما دی ہے اور خود اللہ تعالیٰ نے نوح علیہ السلام پر وحی فرما کر جیسا کہ سورۂ ہود کی آیت ۳۶ سے واضح ہے، اس طرح کے سارے معترضین کے منہ میں مٹی ڈال دی ہے۔

اس فیصلہ الٰہی کے بعد اللہ تعالیٰ نے نوح علیہ السلام کو ایک کشتی تیار کرنے کا حکم دے دیا۔ جس کا ذکر قرآن کریم میں کئی ایک مقامات پر کیا گیا ہے۔ چنانچہ الٰہی فیصلہ کے اعلان کے بعد سورۂ ہود میں اس طرح ارشاد فرمایا، جس کا ترجمہ یہ ہے کہ:

"اور ہماری نگرانی میں اور ہمارے حکم کے مطابق ایک کشتی بنانا شروع کر دے اور ان ظالموں کے متعلق اب ہم سے کچھ عرض معروض نہ کر، یقیناً یہ لوگ غرق ہو جانے والے ہیں۔" (ہود ۱۱:۳۷)

اس طرح جب اللہ تعالیٰ نے نوح علیہ السلام کو اپنے قانون جزائے اعمال کے مطابق سرکشوں کی سرکشی اور متمردوں کے تمرد کی سزا کا اعلان کر دیا اور حفظ ماتقدم کے لئے پہلے نوح علیہ السلام کو ہدایت فرمائی کہ وہ ایک کشتی تیار کریں تاکہ اسباب ظاہری کے اعتبار سے وہ خود اور دوسرے مومنین قانتین اس عذاب سے محفوظ رہیں اور یہ سارا کام ان متمردین کی آنکھوں کے سامنے ہو جو اللہ تعالیٰ کے

نافرمانوں پر نازل ہونے والا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام نے جب حکم الٰہی کشتی بنانی شروع کی تو کفار نے نوح علیہ السلام کا مذاق اڑانا شروع کر دیا اور جب بھی ان کا ادھر سے گزر ہوتا تو کہتے کہ بہت خوب! جب ہم غرق ہونے لگیں گے اس وقت تو اور تیرے ساتھی اس کشتی میں محفوظ رہ کر نجات پا جائیں گے یہ کتنا احمقانہ خیال ہے اور حضرت نوح علیہ السلام بھی ان کو انجام کار سے غفلت اور اللہ کی نافرمانی پر جرأت دیکھ کر انہی کے طرز پر جواب دیتے اور اپنے کام میں مشغول رہتے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی ان کو حقیقت حال سے آگاہ فرما دیا تھا۔ چنانچہ اس سورۂ ہود میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ "اے نوح (علیہ السلام) تو ہماری حفاظت میں ہماری وحی کے مطابق کشتی تیار کئے جا اور اب مجھ سے ان کے متعلق کچھ سوال نہ کر یہ لوگ بلاشبہ غرق ہونے والے ہیں"۔

اب حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے وعدۂ عذاب کا وقت قریب آیا اور نوح علیہ السلام نے اس سے پہلی علامت کو دیکھا جس کا ذکر ان سے کیا گیا تھا کہ "زمین کی تہ میں سے پانی کا چشمہ ابلنا شروع ہو جائے گا" اور جب وحی الٰہی کے مطابق چشمہ ابل پڑا تو اس وقت وحی الٰہی نے ان کو حکم سنایا کہ کشتی میں اپنے خاندان کو بیٹھنے کا حکم دو اور تمام جانداروں میں سے جن کی آپ کو ضرورت ہے ان کا ایک ایک جوڑا بھی کشتی میں سوار کر لو اور وہ مختصر جماعت بھی جو آپ پر ایمان لا چکی ہے، سب کشتی میں سوار ہو جاؤ۔ اس حکم الٰہی کے بعد آسمان کو حکم الٰہی ہوا کہ پانی برسانا شروع کر دے اور زمین کو حکم ہوا کہ وہ اپنا پانی باہر نکالنا شروع کر دے۔ اس طرح ہر طرف سے یہ طوفان امڈ آیا اور اللہ تعالیٰ کے اس حکم تکوینی کے مطابق نوح علیہ السلام اور دوسرے سارے انسانوں اور حیوانوں کو بچا لیا گیا جو کشتی میں سوار کر لئے گئے تھے اور باقی قوم کو نوح علیہ السلام اور آپ پر ایمان لانے والوں کی آنکھوں کے سامنے غرق کر کے رکھ دیا۔ اس طرح وہ سب قانون الٰہی کے مطابق اپنے اعمال کی پاداش میں کیفر کردار کو پہنچ گئے۔ اس میں کتنی مدت لگی اور یہ سیلاب کتنے وقت تک رہا اور کشتی کی پوری داستان کہ وہ کتنی لمبی، چوڑی اور اونچی تھی اس کی ایک منزل تھی یا دو تھیں، سب کا ذکر سورۃ الاعراف کی آیت ۶۴ میں بیان کر دیا گیا ہے۔ (ملاحظہ ہو عروۃ الوثقیٰ، جلد سوم، آیت مذکورہ)

"جب کشتی پانی پر تیرنے لگی اور پانی جوں جوں وقت گزر رہا تھا چڑھتا ہی چلا جا رہا تھا تو اس وقت نوح علیہ السلام نے دیکھا کہ ان کا اپنا بیٹا بھی اپنے آپ کو طوفان سے بچانے کے لئے اپنی عقل و فکر کے مطابق کوشش میں مصروف ہے تو فطری تقاضے کے مطابق بیٹے کو آواز دے دی کہ "اے میرے بیٹے! ہمارے ساتھ کشتی میں سوار ہو جا اور کافروں کے ساتھ نہ رہ۔" بیٹے نے ایسے نازک وقت میں بھی باپ کی

ایک نہ مانی بلکہ رو در رو باپ کو جواب دیا کہ "میں پہاڑ پر پناہ لوں گا وہ مجھے پانی کی زد سے بچالے گا"۔ نوح علیہ السلام نے بیٹے کا جواب سن کر ارشاد فرمایا کہ بیٹا (تو کس خیال خام میں مبتلا ہے؟) آج اللہ کی (ٹھہرائی ہوئی) بات سے کوئی بچانے والا نہیں مگر ہاں! وہی جس پر رحم کرے۔" (ہود ۱۱: ۴۳) باپ بیٹے میں یہ بات جاری ہی تھی کہ "دونوں کے درمیان ایک ایسی موج حائل ہوئی کہ نوح علیہ السلام کی آنکھوں کے سامنے آپ کے بیٹے کو بہا کر لے گئی اور اس طرح آپ کا بیٹا دوسرے کافروں کے ہمراہ غرق کر کے رکھ دیا گیا۔" (ہود ۱۱: ۴۳)

اس فطری اضطرار کی حالت میں نوح علیہ السلام نے اپنے رب کریم کو صدا دی کہ "اے میرے اللہ! میرا بیٹا تو میرے گھر کے لوگوں سے ہے اور یقیناً تیرا وعدہ بھی سچا ہی ہوتا ہے، تجھ سے بہتر فیصلہ کرنے والا بھی اور کوئی نہیں۔" اصل ماجرا کیا ہے؟ اس پر ہمارے بعض مفسرین نے یہ اعتراض کیا ہے کہ نوح علیہ السلام نے یہ دعا کر کے ایک غلطی کی۔ لیکن ہمیں افسوس ہے کہ بات خود ان مفسرین کی سمجھ میں نہ آئی اور اعتراض نوح علیہ السلام پر جڑ دیا اور پھر خود ہی سوال اٹھا کر اس کے فرضی جواب دینے شروع کر دیے۔

بلاشبہ یہ نوح علیہ السلام نے استدعا کی لیکن کب کی؟ جب کہ بیٹا غرق ہو چکا تھا۔ تو پھر یہ دعا بیٹے کے بچالینے کی دعا کیسے ہوئی؟ بیٹے کے بچائے جانے کی دعا تو اس وقت متصور ہوتی جب وہ زندہ ہوتا اور آپ علیہ السلام اللہ سے فرماتے کہ اللہ میرا بیٹا ڈوبا جا رہا ہے، اس کو بچالے۔ حالانکہ اس کو ڈوبتا دیکھ کر اس کو اس بات کی تلقین فرمائی ہے کہ بیٹا ہمارے ساتھ سوار ہو جا کہ تیری جان بچ سکے لیکن جب بیٹا نہ مانا بلکہ اپنے والد کو اس سوال کا جواب رو در رو سنا دیا کہ میں پہاڑ پر چڑھ کر جان بچاؤں گا اب تیری بیڑی اس پانی سے نہیں بچ سکتی یہ تو ابھی کسی پہاڑ کے ساتھ ٹکرا کر پاش پاش ہونے والی ہے۔ اس کی یہ بات سن کر پھر اس کو جواب بھی دیا کہ آج اللہ کی ٹھہرائی ہوئی بات سے بچانے والا کوئی نہیں؟ لیکن جب اپنے عمل کی پاداش میں وہ دھر لیا گیا اور جو کچھ ہونا تھا وہ ہو گیا تو اب اس بات کی گویا وضاحت طلب کی تاکہ آنے والے لوگوں کو بھی اچھی طرح معلوم ہو جائے کہ نجات کا دارومدار ہر انسان کے اپنے اعتقاد و عمل کے ساتھ خاص ہے اور اللہ کی توفیق سے جب تک کوئی انسان خود اپنے کیے کی معافی طلب نہیں کرتے، دوسروں کی اپیلوں سے نجات وابستہ نہیں کی گئی۔ اپیل کرنے والا خواہ کوئی ہی کیوں نہ ہو۔ حتیٰ کہ اللہ کا رسول بھی کسی کے لئے اپیل کرے جب کہ اس کے اپنے اعمال و اعتقاد درست نہ ہوں تو اس کو وہ اپیل کچھ فائدہ نہیں دیتی اور نہ ہی نجات کا دارومدار حسب و نسب پر رکھا گیا کہ کوئی فرد یا کوئی

قوم چاہے جو کچھ بھی کرتی رہے اس کو گرفت نہیں ہوگی؟ اس لئے کہ وہ بخشے بخشوائے لوگوں کی نسل و اولاد ہے۔

چونکہ خود اللہ تعالیٰ نے نوح علیہ السلام سے فرمایا تھا کہ "تیرے اہل کو نجات دی جائے گی اور اس کے ساتھ ہی استثنا بھی کر دی کہ "مگر ہاں! وہ لوگ تیرے اہل و عیال میں داخل ہی نہیں جن کے متعلق پہلے ہی فیصلہ کیا جا چکا ہے۔" اگر نوح علیہ السلام یہ سوال نہ اٹھاتے جو آپ نے بارگاہ ایزدی میں اٹھایا تو نہ معلوم کتنے لوگ نوح علیہ السلام کے بیٹے کو آپ کا بیٹا سمجھتے ہوئے اہل ہی سمجھتے اور ان کے ذہن میں یہ سوال اٹھتا کہ نوح علیہ السلام کا بیٹا نوح علیہ السلام کا اہل ہونے کے باوجود غرق کیسے ہو گیا؟ اس لئے نوح علیہ السلام کے سوال کے جواب میں اللہ نے پوری وضاحت فرما دی کہ اے نوح علیہ السلام! وہ تیرا اہل ہی کب تھا؟ کہ ہم نے اس کو نہیں بچایا" لیس من اھلک "وہ تیرا اہل تھا ہی نہیں اس لئے کہ "انہ عمل غیر صالح" وہ تو (سرتاپا) عمل بد ہے یعنی جب وہ تیری راہ نہ چلا اور بدعملوں کا ساتھی ہوا تو فی الحقیقت تیرے حلقہ قرابت سے وہ باہر ہو گیا اور اب اسے اپنا نہ سمجھ۔

اس طرح نوح علیہ السلام کو اس طرح کے سوال سے روک کر آنے والی ساری نسلوں کو یہ سبق سکھا دیا کہ جس سے سوال کر رہا ہوں، اس سے ایسا سوال کرنے کا حق ہے یا نہیں؟ اور اللہ تعالیٰ ایسی باتوں کو سمجھانے کے لئے انبیائے کرام علیہم السلام ہی کو مخاطب فرما کر نبی کی قوم سے بات کرتا ہے تاکہ قوم تجزیہ ہونے کی بجائے غور و فکر سے کام لے اور دوسری بات یہ تفہیم کرا دی کہ بلاشبہ یہ دعا بھی ایک طرح کا سوال ہی ہے لیکن ہر سوال دعا نہیں اور کچھ ناسمجھوں نے اس بات کو نہیں سمجھا اور نہ سمجھنے کی کوشش کی اور رسول اللہ یعنی نوح علیہ السلام پر اعتراض جڑ دیا کہ انہوں نے اپنے بیٹے کو غرق ہونے سے بچانے کی دعا کی حالانکہ یہ بات فی نفسہ صحیح نہیں۔

ہمیں معلوم ہے کہ سورہ ہود کی اس آیت ۴۶ کے تحت اور خصوصاً "انہ عمل غیر صالح" سے نوح علیہ السلام کی بیوی پر بیہودہ الزام رکھنے کی بھی بے جا کوشش کی ہے لیکن ایسے غالی بے حیاؤں کی باتوں کے بیان کے لئے تفسیر کے علاوہ تاریخ و سیر کی کتابیں ہیں اور اس سلسلہ میں نبی کریم ﷺ کی احادیث واضح ہیں کہ نبی کے حسب و نسب میں کفر و نفاق ممکن ہے لیکن فعل زنا ممکن ہی نہیں کیونکہ اس سے حسب و نسب کا تعلق ہے اور ہر نبی کا حسب و نسب بتائید ایزدی محفوظ رہا ہے اور کسی کو اپنی عصمت محفوظ رکھنے کی ہدایت کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ اس میں بدکاری کا خطرہ تھا بلکہ اس ڈانٹ کا تعلق ہمیشہ امت کی بیٹیوں کو ایک سبق سکھانا ہے اور اس کا ایسا طریقہ ہر مذہب و ملت میں موجود ہے اور صاحب عقل و فکر سے

یہ بات پوشیدہ نہیں ہے۔

بلاشبہ نوح علیہ السلام کی بیوی منافقہ تھی جیسا کہ لوط علیہ السلام کی بیوی بھی منافقہ تھی لیکن کسی کا منافق ہونا اس بات کی دلیل نہیں ہوسکتا کہ وہ زانی یا مشرک بھی تھا اور نہ ہی یہ بات درست ہے کہ کسی منافق یا کافر کو زانی یا مشرک بھی کہا جائے تو خیر ہے۔ بلاشبہ ہر شرک کفر ہے لیکن ہر کفر شرک نہیں اس لیے ہر مشرک کو کافر کہا جاسکتا ہے لیکن ہر کافر کو مشرک نہیں کہا جاسکتا۔ عوام ان باتوں سے اگرچہ ناواقف ہوں لیکن اپنے آپ کو زمرہ علماء اور مفسرین میں شامل کرنے والوں پر یہ بات پوشیدہ نہیں ہونی چاہئے تھی۔ نہ معلوم اس طرح کے سوال کیوں اٹھائے گئے اور گندی ذہنیت کے لوگوں نے ایسا گند کہاں کہاں پھیلا دیا۔

بہر حال نوح علیہ السلام کے اس سوال سے آنے والی نسلوں پر یہ حقیقت آشکارا ہوگئی کہ وعدۂ نجات کا منشاء نسل و خاندان نہیں ہے بلکہ ایمان باللہ ہے، لیکن ہمیں افسوس ہے کہ باقی قوموں کا ذکر کیا اس قرآن کریم کی حامل قوم آج بھی اس غلطی میں اس طرح ڈوبی ہوئی ہے جس طرح پہلی قومیں ڈوبی ہوئی تھیں اور مسلمانوں کی اکثریت آج بھی اس حسب ونسب پر نجات کا دارومدار سمجھتی ہے، چند معدودے آدمی ہوں گے جو اس بیماری کا شکار نہ ہوں بلکہ حکومت کے سربراہوں سے لے کر عوام تک سارے کے سارے اس مرض میں مبتلا ہیں۔ الا یہ کہ اس بندہ پر جس پر اللہ کا خاص فضل ہو۔

تورات کے بیان کے مطابق یہ کشتی 150 دن یعنی پانچ ماہ برابر پانی پر حیرتی رہی۔ اصل حقیقت حال تو اللہ ہی جانتا ہے تاہم انجام کار نوح علیہ السلام کی کشتی "جودی" پر پہنچ کر رک گئی۔ جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہے کہ اور پھر اللہ کا حکم ہوا کہ اے زمین اپنا پانی پی لے اور اے آسمان تھم جا اور پانی کا چڑھاؤ اتر گیا اور حادثہ انجام پا گیا اور کشتی جودی پر ٹھہر گئی اور کہا کہ نامرادی اس گروہ کا مقدر تھی جو ظلم کرنے والا گروہ تھا"۔ (ہود، ۱۱:۴۴)

پھر تورات ہی کے بیان کے مطابق جودی کو ارارات کے پہاڑوں میں سے بتایا گیا ہے اور ارارات درحقیقت ایک جزیرہ کا نام ہے یعنی اس علاقہ کا نام جو فرات و دجلہ کے درمیان دیار بکر سے بغداد تک مسلسل چلا گیا ہے پانی آہستہ آہستہ خشک ہونا شروع ہوگیا اور ساکنان کشتی نے دوسری بار امن وسلامتی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی زمین پر قدم رکھا اور زمین کا وہ علاقہ جو ایک بار مکمل طور پر تباہ و برباد ہو کر رہ گیا تھا انہی لوگوں سے اللہ نے اس کو پھر آباد کر دیا اور انہی لوگوں کی نسل سے اس واقعہ کو قصہ پارینہ سمجھ کر بھلا دیا اور پھر آہستہ آہستہ وہی کفر و شرک اور فساد فی الارض کی شرارتیں شروع کر دیں۔

اب قابل غور وفکر ایک بات رہ جاتی ہے کہ کیا؟ یہ کہ آیا طوفان نوح پوری دنیا پر تھا یا کسی خاص خطہ پر؟ اس کے متعلق قدیم سے ہمیشہ دو رائیں رہی ہیں اور اسی طرح آج بھی کچھ کی یہ رائے ہے کہ طوفان تمام کرۂ ارض پر آیا اور کچھ کی رائے ہے کہ نہیں صرف اس خطہ میں آیا جس میں نوح علیہ السلام کی قوم آباد تھی۔ ظاہر ہے کہ دوسری بات ہی زیادہ صحیح اور سچی معلوم ہوتی ہے اس لئے کہ یہ قصہ قوم نوح ہی کے نام سے معروف ہے۔

پوری انسانیت کے نام سے معروف نہیں ہے جیسا کہ صالح، ہود اور شعیب علیہ السلام کے قصے بیان کئے گئے ہیں اور یہ بھی کہ پوری انسانیت کے لیے رسول صرف اور صرف ایک ہی بنائے گئے اور وہ محمد رسول اللہ ﷺ ہیں، باقی سارے رسول اپنی اپنی قوم ہی کی طرف مبعوث ہوئے تھے اور حدیث میں اس کی وضاحت بھی موجود و محفوظ ہے۔

قرآن کریم میں صراحتاً موجود ہے کہ نوح علیہ السلام نے اپنی قوم میں ساڑھے نو سو سال تبلیغ و دعوت کا فرض انجام دیا۔ جیسا کہ ارشاد ہوا کہ:

ولقد ارسلنا نوحا الی قومہ فلبث فیھم الف سنۃ الا خمسین عاما۔ (العنکبوت ۲۹:۱۴)

"ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا اور وہ پچاس کم ایک ہزار سال ان کے درمیان رہا"۔

یہ عرصہ عمر سے بہت ہی زیادہ ہے اس پر علمائے امت میں سے بعض نے "سنۃ" کے لفظ پر بحث کر کے اس کو مہینہ کے برابر لانے کی کوشش کی اور اس طرح بعض نے "سنۃ" کی تشریح میں اور بھی بہت کچھ کہا ہے۔ اصل حقیقت حال اللہ ہی جانتا ہے لیکن ایک بات قابل ذکر اور قابل غور ہے کہ قرآن کریم نے بہت سے انبیاء کرام علیہ السلام کا ذکر کیا ہے لیکن اس کے ذکر میں اس کی عمر یا اس کی قوم کی عمر کے متعلق کہیں کچھ نہیں کہا اس طرح بہت سے مقامات پر جو کچھ کتب سابقہ میں کہا گیا تھا اس کو حکایتی رنگ میں بھی بیان کیا جب کہ اس میں کوئی کفر و شرک اور بداخلاقی و بدکرداری کی بات نہ تھی۔ اسی طرح نوح علیہ السلام کی عمر کے متعلق ایسا کہنا کفر و شرک کی طرح کی منافقت یا بداخلاقی و بدکرداری کی بات نہ تھی اور تورات میں اسی طرح مذکور بھی ہے لہٰذا اس کا رنگ وہی حکایتی ہو۔ ممکن ہے اور اس جگہ قرآن کریم کی سورۃ العنکبوت کی آیت ۱۴ کے آخری الفاظ سے یہ بات مترشح بھی ہوتی ہے۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا کہ:

• فاخذھم الطوفان وھم ظلمون۔ (العنکبوت ۲۹:۱۴)

"آخر کار ان لوگوں کو طوفان نے آگھیرا اس حال میں کہ وہ ظالم تھے"۔

اس سے یہ بات واضح ہوتی معلوم ہوتی ہے کہ جب طوفان آیا تو اس وقت نوح علیہ السلام ان غرق ہونے والوں میں ساڑھے نو سو سال رہ چکے تھے لیکن آخر نوح علیہ السلام ان غرق ہونے والوں کے بعد بھی تو زندہ رہے اور اس طرح آپ کے ساتھ کشتی میں سوار ہونے والے بھی اور اس بات کا کہیں ذکر نہیں کہ وہ قوم کی غرقابی کے بعد کتنی مدت تک زندہ رہے۔ اس لحاظ سے مذکورہ عمر بڑھے گی، خواہ یہ معلوم نہ ہو کہ وہ کتنی مزید بڑھی۔

اس طرح اس سے یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ کشتی میں سوار ہونے کے وقت جن لوگوں کی غرقابی کا حکم ہوا وہ وہی لوگ تھے جنھوں نے نوح علیہ السلام کی شروع سے مخالفت شروع کی تھی یا ان کی نسل کے لوگ تھے چاہے وہ بھی مخالف ہی ہوں کیونکہ اگر وہی لوگ تھے جنھوں نے شروع میں مخالفت کی تھی تو پھر ان سب کی عمر بھی قریب قریب نوح علیہ السلام ہی کے ہوگی یا ان سے کچھ زیادہ یا کچھ کم اور پھر نوح علیہ السلام کے ساتھ بچنے والوں میں وہ لوگ بھی تھے جو شروع ہی میں ایمان لائے تھے یا ان کی اولاد در اولاد۔ اس طرح ان ساری باتوں کا تجزیہ کرنے سے یہ بات مزید واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن کریم کا یہ بیان حکایتی رنگ کا ہے اور حقیقت حال اللہ ہی کے پاس ہے اور ظاہر اجو کچھ بیان ہوا ہمارا اس پر پختہ یقین ہے۔

مزید تفصیلات معلوم کرنا چاہیں تو قصص کی کتابوں کا مطالعہ کریں۔ اب اس جگہ استفادہ کے لئے چند باتوں کا مزید اختصار کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے تاکہ کچھ نہ کچھ یاد رہ جائے۔ اللہ کرے کہ ہماری یاد میں کچھ رہ بھی جائے۔

۱) سیدنا نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو سب سے پہلے توحید الٰہی کا درس دیا اور فرمایا کہ میری قوم کے لوگو! اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو۔

۲) اگر تم سرکشی سے باز نہ آئے تو اچھی طرح سن لو کہ عذاب کا ایک بڑا ہی دردناک دن آنے والا ہے۔

۳) قوم کے سرداروں اور اونچے درجے کی جماعتوں نے انکار و سرکشی کی۔ صرف معدودے چند لوگ ایمان لائے وہ بھی وہی تھے جو قوم میں بے وقعت سمجھے جاتے تھے اور قوم کے وڈیرے ان کیساتھ بیٹھنا اٹھنا بھی پسند نہ کرتے تھے۔

۴) منکرین نے کہا کہ تم بھی ہماری ہی طرح ایک آدمی ہو پھر تمہاری بات کیوں مانیں؟ یعنی اگر تم میں کوئی ایسا اچنبھا پایا جاتا ہو اور آدمیوں میں نہیں پایا جاتا یا دیوتاؤں کی طرح اتر آئے ہوتے تو تمہاری

تصدیق کرتے۔

۵) منکرین نے یہ بھی کہا کہ جو ہم میں کمینے اور بے وقعت ہیں وہی بے سمجھے بوجھے تمہیں مان رہے ہیں آخر کوئی باپ دادا والا آدمی آپ کی بات سننے کے لئے تیار بھی ہے؟ پھر کیا ان بے وقوفوں کی طرح ہم بھی مان لیں؟ اور پھر یہ بھی کہ ہم ایسی جماعت میں کیونکر شریک ہو سکتے ہیں جہاں رذیل و شریف میں کوئی امتیاز نہیں ہے؟

۶) سیدنا نوح علیہ السلام نے کہا کہ انسان کی ہدایت تو انسان ہی کے لئے ہو سکتی ہے اور وہ اتنا ہی کر سکتا ہے جو اس کے اختیار میں ہے تم کہتے ہو کہ میں جھوٹا ہوں لیکن یہ تو بتلاؤ کہ اگر تم مجھے سچا سمجھتے ہو تو کیا اس بات کی توقع کرتے کہ میں جبراً تم کو بھلائی کی راہ دکھا دوں اور اس پر بزور چلا بھی دوں؟ اللہ کی طرف سے کتنی ہی واضح دلیل حق مجھے مل گئی ہو لیکن تم سمجھنے سے انکار کر دو تو میں کیا کر سکتا ہوں؟

۷) انھوں نے کہا کہ تم جتنے لوگوں کو ذلیل سمجھتے ہو میں سمجھی نہیں کہوں گا کہ وہ ذلیل ہیں اور انہیں خوبی و سعادت نہیں مل سکتی اگر میں ایسا کروں تو اللہ کے مواخذہ میں گرفتار ہو جاؤں۔

۸) انھوں نے فرمایا کہ میرا دعویٰ تو صرف یہ ہے کہ میں سچائی کا پیغامبر ہوں مجھے طاقت و تصرف کا دعویٰ نہیں اور نہ ہی انسانوں سے برتر کوئی ہستی ہوں۔

۹) منکروں نے ان دلائل و مواعظ پر غور کرنے سے انکار کر دیا بلکہ وہ ان باتوں کو "جدال" سے تعبیر کرنے لگے اور یہاں تک سرکشی کی کہ خود عذاب کے ظہور کا مطالبہ کرنے لگے۔

۱۰) اس پر ارشاد الٰہی ہوا کہ کہہ دے تم کہتے ہو کہ میں مفتری ہوں تو میرا گناہ مجھ پر اور تم سچائی کو جھٹلا رہے ہو تو اس کی پاداش تم کو جھیلنی ہے میں اس سے بری ہوں، اب فیصلے کا انتظار کرو۔

۱۱) حضرت نوح علیہ السلام کا وحی الٰہی سے مطلع ہونا کہ جو ایمان لا چکے ہیں ان کے سوا کوئی ایمان لانے والا نہیں اور یہ کہ ملک غرق ہونے والا ہے، بس ایک کشتی بنا لو۔

۱۲) یہ باتیں سن کر منکرین کا تمسخر اڑانا۔

۱۳) طوفان کا ظہور اور حضرت نوح علیہ السلام کا کشتی میں سوار ہونا اور ان سب لوگوں کو ساتھ لے لینا جن کے ساتھ لینے کا حکم ہوا۔

۱۴) سیلاب نے اتنا گہرا پانی جمع کر دیا تھا اور طوفانی ہواؤں کا یہ عالم تھا کہ اونچی اونچی موجیں اٹھنے لگی تھیں۔